نظامِ معاشرہ اور تعلیم

از
برٹرنڈ رسل

ترجمہ
جی۔ آر۔ عزیز

زیرِ نگرانی
عبد المجید سالک

•

مجلسِ ترقیِ ادب
کلب روڈ، لاہور

نظامِ معاشرہ اور تعلیم

از

برٹرنڈ رسل

مترجمہ

جی۔ آر۔ عزیز

زیرِ نگرانی

عبدالمجید سالک

مجلسِ ترقیِ ادب

کلب روڈ، لاہور

طبع سوم : فروری ۱۹۸۸ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
ناظم مجلس ترقی ادب ، لاہور

مطبع : مکتبہ جدید پریس ، نوائے وقت ہاؤس ، لاہور

طابع : رشید احمد چودھری

قیمت : ۔/۳۰ روپے

فہرستِ ابواب

باب اول

فرد اور شہری کا موازنہ

اگرچہ دنیا کی تمام مہذب حکومتیں تعلیم کی افادی حیثیت پر متفق ہیں، لیکن پھر بھی یہ مسئلہ بعض ایسے لوگوں کے درمیان، جن کی رائے واجب الاحترام تسلیم کی جاتی ہے، موضوع بحث بنا رہا ہے۔ بعض لوگ تعلیم کی ممانعت اس بنا پر کرتے ہیں کہ وہ اپنے بیان کردہ مقاصد کے حصول میں ناکام رہی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ان کی اس رائے کا بخوبی جائزہ لیں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان مقاصد کی تعیین کر لیں، جو تعلیم کے ذریعے سے حاصل کیے جا سکتے ہیں؛ لیکن اس مسئلے میں بھی خیالات اسی قدر گوناگوں ہیں جس قدر فلاحِ انسانی کے تصورات مختلف ہیں، البتہ دو گروہوں میں مزاجی اختلاف کی ایک ایسی خلیج حائل ہے جو باقی تمام اختلافات سے زیادہ گہری ہے۔ پہلا وہ گروہ ہے جو تعلیم پر اس حیثیت سے غور کرتا ہے کہ اس کا تعلق صرف ایک فرد کی ذات سے ہے، اور دوسری وہ جماعت ہے جو تعلیم کو قومی زاویۂ نگاہ سے پرکھتی ہے۔

یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ تعلیم کا مقصد صرف یہی نہیں کہ وہ ان موانع کو جو ترقی کی راہ میں حائل ہوں، ہٹا

دے ، بلکہ اس کا مقصد تربیت کا کچھ سامان کرنا بھی ہے؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا تعلیم کا مقصد اچھے افراد پیدا کرنا ہے یا اچھے شہری؟ ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے ، اور خصوصیت سے وہ لوگ جو ہیگل کے فلسفے سے متاثر ہیں ، یہ کہیں گے کہ ایک اچھے شہری اور اچھے فرد میں کوئی فرق نہیں ۔ اچھا فرد صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جس کا مطمح نظر جماعتی بھلائی ہو اور جماعتی بھلائی ایک ایسا نقشہ ہے جو انفرادی بھلائیوں سے مل کر تیار ہوتا ہے ۔ بطور ایک قطعی ما بعدالطبیعاتی حقیقت کے میں نہ تو اس نظریے کی تائید کرتا ہوں اور نہ تردید، لیکن عملی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس تعلیم کے نتائج جس میں بچے کو ایک فرد سمجھا جاتا ہے ، اُس تعلیم کے نتائج سے بہت مختلف ہوتے ہیں جس میں بچے کو مستقبل کا ایک شہری خیال کیا جاتا ہے ، کیوں کہ ظاہر ہے کہ فرد کی ذہنی نشوونما اور ایک مفید شہری کی تربیت دونوں ایک چیز نہیں ؛ مثلاً جیمز واٹ (James Watt) کے مقابلے میں جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے ایک کمتر شہری تھا ، گو بحیثیت ایک فرد کے وہ کہیں زیادہ اعلیٰ تھا ۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ انفرادی بھلائی جماعتی بھلائی کی ایک چھوٹی سی کسر کے علاوہ کچھ اور شے بھی ہے ۔ انفرادی بھلائی کے بارے میں لوگوں کے خیالات میں کافی تضاد پایا جاتا ہے اور جو لوگ مجھ سے اختلاف رائے رکھتے ہیں ، میں ان سے بحث کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ، لیکن ہمارا نظریہ خواہ کچھ بھی ہو ، اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ

فرد کی نشوونما اور شہری کی تربیت میں فرق ہے ۔

انفرادی بھلائی میں کون کون سی چیزیں شامل ہیں ؟ میں اپنے طور پر (بغیر اس امر کی خواہش کیے کہ دوسرے لوگ بھی میرے خیالات سے اتفاق کریں) اس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں ۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ فرد کو لیبنیز (Leibniz) کے جوہر واحد کی طرح تمام کائنات کی آئینہ داری کرنی چاہیے ۔ یہ کیوں ؟ میں اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں بتا سکتا کہ علم اور ادراک ہی دو شان دار خوبیاں ہیں جن کی بنا پر نیوٹن کو کستورا مچھلی پر ترجیح دی جا سکتی ہے ، کیوں کہ وہ انسان جو فضائے بسیط کی وسعت ، سورج اور تاروں کے ارتقاء ، طبقات الارض کے ادوار اور انسانیت کی مختصر سی تاریخ سب کو سمیٹ کر نہایت واضح طور پر نہاںخانۂ دل میں محفوظ رکھ سکتا ہے ، بلا شبہ انسانی اوصاف کا بہترین مظہر ہے اور قدرت کے بوقلموں مناظر کی تعداد میں اضافے کا موجب ہے ۔ میں اس نظریے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا خواہ جدید طبیعیات کا یہ روز افزوں قیاس درست ہی کیوں نہ ثابت ہو جائے کہ مکان کی گہرائیاں اور زمان کے ماضیٔ تاریک کا غار ، ہر دو صرف ریاضی دانوں کی مساوات کے عددی سر ہیں ۔ ان حالات میں انسان پہلے سے کہیں زیادہ ممتاز بن جاتا ہے جو تاروں بھرے آسمانوں اور کائناتی قدامت کے زمانوں کا موجد قرار پاتا ہے ۔ اگر اس سے اس کے علمی ذخیرے میں کچھ کمی واقع ہوتی ہے تو اس کی قوت متخیلہ کا دامن وسیع تر ہو جاتا ہے ۔

اگرچہ انسان کی برتری کا مدار اس کے ذہنی شعور پر ہے ، پھر بھی یہی سب کچھ نہیں ۔ فقط کائنات کی آئینہ داری ہی کافی نہیں ، یہ آئینہ داری جذبے کے زیر اثر ہونی چاہیے اور وہ جذبہ شئے مقصود کے حسبِ حال ہونا چاہیے اور اس میں مسرتِ علم کی چاشنی شامل ہو ، لیکن علمِ اشیا اور جذبات مل کر بھی پوری انسانیت کی ترجمانی نہیں کر سکتے ، لیکن اس تغیر پزیر دنیا میں انسان خود بھی تبدیلیوں کا باعث ہوتا ہے ۔ اس احساس کی بنا پر وہ اپنی قوتِ ارادی سے کام لیتا ہے اور اس طرح اسے اپنی اس طاقت کا احساس ہوتا ہے ۔ علم ، جذبات اور قوت کے حلقے کو تا بہ حدِ امکان وسعت دینا انسانی شخصیت کی تکمیل کے لیے ضروری ہے ۔ روایتی دینیات کے مطابق قوت ، عقل اور محبت اقالیمِ ثلاثہ کے مخصوص اوصاف ہیں ۔ کم از کم اس ایک معاملے میں انسان نے خدا کو اپنی صورت کے آئینے میں دیکھنا چاہا ہے ۔

اس بحث میں ہم انسان کو ایک فرد کے طور پر دیکھ رہے ہیں ۔ ہم اسے اس رنگ میں دیکھ رہے ہیں جس میں بدھ مت ، رواقی فلسفیوں ، عیسائی بزرگوں اور متصوفین نے اسے دیکھا تھا ۔ ایک مکمل فرد میں علم اور جذبات کے جن عناصر کی تصویر ہم نے کھینچی ہے ، وہ لازمی طور پر عمرانی نہیں ، کیوں کہ قوتِ ارادی اور قوت کے بروے کار لانے ہی سے یہ فرد جس کا ہم تصور کر رہے ہیں ، جماعت کا ایک مؤثر رکن بن سکتا ہے

اور اسی قوتِ ارادی کے زور سے اپنے صرف ایک آمر کا مقام مل سکتا ہے ، اس لیے کہ فرد کی قوتِ ارادی کو جب بالکل الگ تھلگ کر کے دیکھا جائے تو یہ خدائی عزم کے ہم پلہ نظر آتی ہے جو 'کُن' کہنے کا عادی ہے ۔ بخلاف ایک شہری کے کہ اس کا انداز بالکل مختلف ہوتا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے علاوہ اور لوگوں میں بھی اس کا سا ارادہ موجود ہے ۔ یہ اس کا فرض ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے ، وہ ان متضاد ارادوں میں جو معاشرے میں موجود ہیں ، ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرے ۔ فرد بہ حیثیت فرد کے اپنے آپ کو باقی بالذات خیال کرتا ہے ، لیکن ایک شہری خود کو اپنے ہمسایوں میں گھرا پاتا ہے ۔ رابن سن کروسو (Robinson Crusoe) کے سوا ہم سب لوگ لازماً شہری ہیں ، اس لیے یہ خیال ہمیشہ تعلیم کے پیش نظر رہنا چاہیے ۔

لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی زندگی کے سمجھوتوں اور اس کی مصلحت آمیز خاموشیوں کی طرف جھکنے سے پہلے بہ حیثیت فرد ہمیں اپنی تمام خوابیدہ قوتوں کا علم ہونا چاہیے ، تاکہ ہم انجام کار زیادہ مفید شہری بن سکیں ۔ ایک شہری کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ عملی طور پر نہ سہی کم از کم ارادی طور پر دوسروں سے تعاون کرنا چاہتا ہے ۔ اب جو شخص دوسروں کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہے ، سوائے اس صورت کے کہ وہ غیر معمولی استعدادوں کا مالک

ہو ، اپنے گرد و پیش پر نظر ڈال کر کسی ایسے
ترشے ترشائے مقصد کی جستجو کرے گا جس میں وہ
دوسروں کے ساتھ مل کر کام کر سکے ۔ صرف ایک
فوق العادۃ عظمت کے انسان ہی سے یہ توقع رکھی جا سکتی
ہے کہ وہ انفرادی فکر سے کوئی ایسا نصب العین
وضع کرے جس کے ساتھ تعاون کرنے میں لوگوں کو
بہتری نظر آئے اور جب ایسا نصب العین تیار ہو جائے
تو وہ دوسروں کو اس کی پیروی پر آمادہ بھی کر سکے ۔
فیثا غورس کو علم ہندسہ کا مطالعہ بھلا معلوم ہوا
جس کی بنا پر سکول کے طلبہ اب تک اسے بجا طور پر
برا بھلا کہتے ہیں ، لیکن شہریت کی ایسی تنہائی پسند
اور تخلیقی صورتیں بہت کم یاب ہیں اور اس تعلیم سے
جس کا مقصد جذبۂ مدنیت کی تربیت کرنا ہو ، عام طور پر
ایسے نتائج کی توقع نہیں رکھی جا سکتی ۔ حکومت کے
عندیے کے مطابق صرف وہی شخص صحیح شہری کہلا
سکتا ہے جو چیزوں کو جوں کا توں دیکھنا پسند کرے
اور مروجہ نظام کی حفاظت کے لیے کوشش کرنے پر
بھی آمادہ ہو ۔ سب سے بڑی بوالعجبی یہ ہے کہ جہاں
تمام حکومتوں کا مطمح نظر اسی قسم کے شہری ہی
پیدا کرنا ہے ، ان کی تاریخ کے مشاہیر ہو بہو اسی طرح
کے لوگ تھے جس طرح کے افراد کے وجود کو ختم کرنا
ان کا نصب العین ہے ۔ اہل امریکہ یوں تو واشنگٹن
اور جیفرسن کے بڑے مداح ہیں ، لیکن جو لوگ ان
کے سے سیاسی خیالات رکھتے ہیں ، انھیں قید خانے میں

ٹھونس دیتے ہیں ۔ اسی طرح انگریز بوڈیشیا (Boudicia) کے بڑے مداح ہیں ، لیکن اگر وہ اس وقت جدید ہندوستان میں رونما ہو تو اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو اہل روم نے اس کے ساتھ روا رکھا تھا ۔ تمام مغربی اقوام حضرت مسیح علیہ السلام کی مدح خواں ہیں ، لیکن اگر وہ اس وقت زندہ ہوتے تو برطانوی پولیس انھیں مشتبہ خیال کرتی ، نیز چونکہ وہ اسلحہ باندھنے سے انکار کرتے ، حکومتِ امریکہ انھیں حقوقِ شہریت دینے سے انکار کر دیتی ۔ ان مثالوں سے واضح ہو گیا ہوگا کہ شہریت بہ حیثیت نصب العین کس قدر نا کافی ہے ، کیوں کہ شہریت کو زندگی کا نصب العین قرار دینے سے انسان کی تمام تخلیقی قوتیں فنا ہو جاتی ہیں اور ایسا شخص برسر اقتدار طاقت سے ، خواہ وہ شخصی ہو یا جمہوری ، آمادۂ مصالحت رہتا ہے ۔ یہ چیز عظیم المرتبت انسانوں کے امتیازی اوصاف کی ضد ہے ۔ اگر اس شہریت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے تو وہ عام انسانوں کو اس خدمت کے حصول سے ، جس کے وہ اہل ہوتے ہیں ، روکتی ہے ۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میں بغاوت کا حامی ہوں ۔ بغاوت فی نفسہ عافیت کوشی سے کسی طرح بہتر نہیں ۔ اس کا مدار اُن اقدار پر نہیں ہوتا جنھیں ہماری اپنی قوت فیصلہ پرکھتی ہے ، بلکہ اس کی اہمیت کا اندازہ خارجی اسباب کی روشنی میں کیا جاتا ہے ۔ بغاوت کے قابلِ ستائش یا قابلِ ملامت ہونے کا مدار اس شے پر ہوتا ہے جس کے

خلاف بغاوت کی جائے، لیکن کبھی کبھی بغاوت کرنے کے امکانات ضرور موجود ہونے چاہئیں۔ ایسا نہ ہو کہ ایک ایسی تعلیم جس میں کوئی لوچ لچک نہ ہو اور جس کا مقصد محض یکسانی ہو، اندھا دھند مصلحت کوشی کے سوا کچھ اور پیدا ہی نہ کرے، لیکن بغاوت اور مصالحت پسندی سے یہ امر کہیں زیادہ اہم ہے کہ انسان اپنے لیے ایک نیا لائحۂ عمل تجویز کر سکے، بالکل جیسے فیثا غورس نے علم ہندسہ ایجاد کر کے کیا تھا۔

شہریت اور فردیت کے درمیان جو اختلاف ہے، وہ تعلیم، اخلاقیات، سیاسیات اور ما بعد الطبیعیات میں یکساں طور پر اہم ہے۔ تعلیم میں اس کی نوعیت نسبتاً سادہ اور عملی ہے جس پر کسی حد تک نظری پہلو سے علیحدہ ہو کر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ کسی قوم کے تمام نوجوانوں کی تعلیم کا مسئلہ کثیر مصارف کا مقتضی ہے اور یہ مصارف لا محالہ زیادہ تر ریاست کے ذمے ہوں گے۔ دوسرا ادارہ جو بچوں کی ذہنی تشکیل سے کافی شغف رکھتا ہے اور ان کی تعلیم و تربیت میں اہم حصہ لے سکتا ہے، وہ مذہب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت کا مقصد شہریوں کی تربیت کرنا ہے اور بعض تاریخی وجوہ کی بنا پر قدیم روایات نے بڑی حد تک اس مقصد کو محدود کر رکھا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں تعلیم سے صرف پادریوں کی تعلیم مراد تھی۔ نشاۃ ثانیہ سے لے کر اب تک تعلیم کا مقصد یہ رہا ہے

کہ شرفاء کو تعلیم دی جائے۔ اشراق جمہوریت کے زیر اثر تعلیم کا مقصد یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ انسان کو شرفاء کا ظاھری روپ عطا کر دے۔ مدارس میں طلبہ کو بہت سی ایسی چیزیں پڑھائی جاتی ھیں جو اُن کے لیے بطور شہری چنداں کار آمد نہیں، بلکہ ان کی غرض محض یہ ھے کہ اُنھیں اشرافی ظاھر داری سکھا دی جائے۔ اسی طرح تعلیم کے باقی عناصر از منۂ وسطیٰ کی اُن کلیسائی روایات کی یادگار ھیں جن کا مقصد انسان کو آئین خداوندی سے شناسا کرانا تھا۔

شرافت اور خدا پرستی ایک فرد کے اوصاف ھیں، نہ کہ ایک شہری کے۔ عیسائیت بہ حیثیت مجموعی افراد کا مذھب ھے، کیوں کہ عیسائیت نے ان لوگوں میں جنم لیا جو سیاسی اقتدار سے بے بہرہ تھے۔ بنیادی طور پر یہ مذھب روح انسانی اور خدا کے باھمی تعلقات سے واسطہ رکھتا ھے اور گو یہ انسان اور اس کے پڑوسیوں کے باھمی تعلقات پر بھی نگاہ ڈالتا ھے، تاھم اس کی رائے میں یہ تعلقات خود انسان کے اپنے جذبات کی پیداوار ھیں، قانون اور معاشرتی اداروں کا نتیجہ نہیں۔

موجودہ عیسائیت میں جو سیاسی عنصر دکھائی دے رھا ھے، وہ شہنشاہ قسطنطین کے ساتھ اس مذھب میں داخل ھوا۔ اس بادشاہ کے عہد سے پہلے حکومت کا حکم نہ ماننا ھر عیسائی کا فرض تھا، مگر قسطنطین کے وقت سے لے کر اب تک ھر عیسائی اکثر و بیشتر حکومت

کی فرماں برداری کو فرض خیال کرتا رہا ہے، لیکن عیسائیت کی لاحکومتی اصل نے ایک ایسا خمیر باقی چھوڑا ہے جس کے طفیل اس کی ساری تاریخ میں قدیم جذبۂ نافرمانی نے کئی بار سر اٹھایا ہے ۔ کتھاری البی جنس (Cathari Albigenes) اور روحانیت پرست فرانسسکنز (Franciscans) جماعتوں نے مختلف طریقوں سے اندرونی روشنی کی رہنمائی کو ترجیح دے کر مسلمہ اقتدار کے منشا کو ٹھکرا دیا ۔ اسی طرح پروٹسٹنٹ مذہب کی ابتدا ہی مسلمہ اقتدار کے خلاف بغاوت سے ہوئی، لیکن جب حکومت ان لوگوں کے ہاتھ آ گئی تو ان کے پاس ان مذہبی اختیارات کے استعمال کی کوئی منطقی وجہ نہ تھی جن کے وہ دعوے دار تھے ۔ آخر اپنی بنیادی منطق سے مجبور ہو کر پروٹسٹنٹ فرقے کو مذہبی رواداری کا اصول تسلیم کرنا پڑا ۔ اس رواداری کو کیتھولک فرقے نے نظری طور پر تو کبھی تسلیم نہیں کیا، البتہ بعض عارضی سہولتوں کے پیش نظر اس نے بھی عملی طور پر مذہبی رواداری سے کام لیا ۔ گویا کیتھولک فرقہ رومی شہنشاہوں کی روایات کا حامل ہے اور پروٹسٹنٹ فرقے نے حضرت مسیح ؑ کے حواریوں اور عیسائیت کے پرانے داعیوں کی انفرادیت کی طرف رجوع کیا ہے ۔

مذاہب دو طرح کے ہیں، ایک وہ جو سیاسی ہیں اور دوسرے وہ جو فرد کی روح سے تعلق رکھتے ہیں ۔ کنفیوشس کا مذہب سیاسی تھا ۔ وہ متعدد درباروں میں گھومتا پھرا، لہٰذا لازمی طور پر اسے حکومتی کاروبار

اسطرح مسیح نے دین کو دو حصوں میں بانٹ لیا ہے اور دوسرے کی جسم ... جسم نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا

سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس نے لوگوں میں ایسے اوصاف پیدا کرنے چاہے جن سے بہتر حکومت کی تشکیل آسانی سے ہو سکے۔ اس کے برعکس گو بدھ مذہب شروع شروع میں بادشاہوں کا مذہب رہا ہے، تاہم وہ لازماً ایک غیر سیاسی مسلک ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ اس کی ہمیشہ یہی صورت رہی ہے۔ آج کل تبت میں بدھ مت بالکل اسی طرح سیاسی ہے جیسے نظام پاپائی۔ جاپان میں مجھے بعض ایسے اعلیٰ مذہبی عہدہ داروں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو نائب اسقف اعظم کی یاد دلاتے تھے، تاہم بدھ مت کا ماننے والا اپنے زیادہ مذہبی لمحات میں اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہے۔

اسلام آغاز کار ہی سے ایک سیاسی مذہب تھا۔ محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) نے اپنے آپ کو انسانوں کا حکمران بنایا اور پہلی جنگ عظیم کے اختتام تک ان کے جانشین خلفاء کی یہی حالت رہی۔ اسلام اور عیسائیت میں جو اختلافات ہیں، ان میں ایک امتیازی فرق یہ ہے کہ خلیفہ کی ذات دینی اور دنیوی اختیارات کی جامع ہوا کرتی تھی۔ ایک مسلمان کے نزدیک یہ دونوں چیزیں جدا جدا نہیں۔ عیسائیت نے اپنی غیر سیاسی حیثیت کی بنا پر دو مد مقابل سیاست دانوں کو جنم دیا، یعنی پاپائے اعظم اور شہنشاہ۔ ان دونوں میں سے اول الذکر نے دنیاوی اقتدار کو غیر اہم بتایا اور پھر اس پر بھی اپنا دعویٰ جتلایا۔

اشتمالیت کی وہ شکل جس نے روس میں نشو و نما پائی ہے ، اسلام کے مشابہ ایک سیاسی مذہب ہے ، تاہم وہ ناگزیر طور پر باز نطینی روایات سے متاثر ہے اور اس امر کا امکان ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کلیسا کی جانشین بن جائے اور غیر مذہبی حکومت کو مذہبی اقتدار سے اتنی آزادی دے دے جتنی انقلاب سے پہلے اسے حاصل تھی ۔ دوسرے متعدد امور کی طرح اس معاملے میں بھی روس مشرق اور مغربی ذھنیتوں کے بین بین سا ہے ۔ ایک ایشیائی ملک کے لحاظ سے روس میں اشتمالی پارٹی کی حیثیت خلافت کی سی ہے اور ایک یورپی ملک کے اعتبار سے روس کی اشتمالی جماعت کلیسا کی جانشین ہے ۔

مذاهب کی تعلیم پر طائرانہ نگاہ ڈالنے سے ھمارا مقصد اس طرف اشارہ کرنا تھا کہ موجودہ تعلیم میں جن عناصر کا تعلق انفرادی ثقافت سے ہے ، وہ زیادہ تر قدیم روایات کا نتیجہ ھیں اور اس امر کا قوی احتمال ہے کہ شہریت کی تعلیم آھستہ آھستہ ان کی جگہ لے لے گی ۔ اگر شہریت کی تعلیم کو سوجھ بوجھ کے ساتھ مرتب کیا جائے تو اس میں انفرادی ثقافت کے بہترین پہلو باقی رہ سکتے ھیں ، لیکن اگر اس بارے میں کسی طرح بھی کوتاہ نظری سے کام لیا گیا تو یہ تعلیم فرد کو محض اس لیے مفلوج کر دے گی کہ وہ حکومت کے ھاتھ میں ایک آسان آلۂ کار بن جائے ۔ پس جو شہری نصب‌العین کوتاہ بینی کے زیر اثر وضع کیا جائے گا ، اس کے خطرات کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے ۔ اگر سرکاری

نظام ہائے تعلیم کے بانی اشخاص نے اچھے شہری اوصاف کا تنگ نظرانہ تصور قائم کر لیا تو وہ انسان کا مقام بطور شہری کے بھی پست تر بنا دیں گے۔ صرف وسیع انفرادی ثقافت کے حامل لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ انفرادی ثقافت شہریت کو کیا کچھ عطا کر سکتی ہے، لیکن بد قسمتی سے ان دنوں ایسے لوگوں کی جگہ رفتہ رفتہ ان اشخاص کو سونپی جا رہی ہے جو صرف انتظامی قابلیت کے مالک ہوں یا جنھیں ان کی سیاسی خدمات کا صلہ دینا مقصود ہو۔

اچھے شہری پیدا کرنے والی تعلیم دو قسم کی ہو سکتی ہے جو باہم بہت مختلف ہیں - ایک وہ جس کا مقصد موجودہ نظام کی حمایت ہو، دوسری وہ جو اس کا تختہ اُلٹ دینا چاہے۔ ریاست کو موجودہ نظامِ تعلیم میں جو اہمیت حاصل ہے، اسے مدنظر رکھتے ہوئے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم کا مطمحِ نظر ہمیشہ حالتِ موجودہ کو بحال رکھنا ہی ہوگا، لیکن حقیقت اس کے بر عکس ہے۔ کمیونسٹوں کو روس کے سوا جہاں بھی اقتدار حاصل ہوا ہے، وہاں مذہب اور متوسط طبقے کا رسوخ اتنا قوی ہے کہ وہ تعلیم کے ایک معتدبہ حصے کو رجعت پسند رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے برعکس انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس سے پہلے تعلیم گو عام نہیں تھی، لیکن زیادہ تر حکومت کے خلاف تھی۔ ریاست ہائے متحدہ کے زیادہ پس ماندہ علاقوں میں آج بھی رجحان نظر آ رہا ہے۔ کم و بیش نادانستہ طور پر ریاستوں کی یونیورسٹیوں کا

رجحان ایسے نظریات کی تعلیم کی طرف ہے جو مالیہ ادا کرنے والے بے خبر کسانوں کی طبائع کے خلاف ہیں، حالانکہ یہ یونیورسٹیاں انھی کسانوں کے ادا کردہ ٹیکسوں کے سہارے جیتی ہیں۔ کسان قدرتی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص نے نواز کو بلاتا ہے، آخر لے بھی تو وھی بتاتا ہے، لیکن جس حالت میں وہ نہ نے نواز کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ کس لے میں گا رہا ہے تو یہ چیز انہیں قدرے دشوار دکھائی دیتی ہے، لیکن ان مستثنیات کے باوجود زمانۂ حال میں تعلیم کا رجحان رجعت پسندانہ ہے۔ اگر حکومت قدامت پسند ہے تو یہ اس کی حمایت کرے گی اور اگر ترقی پسند ہے تو مخالفت۔ نیز سکولوں، یونیورسٹیوں میں اچھی شہریت کے ایسے اوصاف پر زور دیا جاتا ہے جو سوء اتفاق سے بہترین ہونے کے بجائے بدترین ہیں۔ سب سے زیادہ ایک طرح کی جنگ جویانہ وطنیت و قومیت پر زور دیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مخصوص رقبے کے رہنے والے باہم تنگ نظرانہ محبت سے اس قدر مربوط ہوں کہ دوسرے علاقوں کے باشندوں کے مفاد کی مخالفت کریں اور اپنے رقبے کے مفاد کو فوجی قوت سے ترقی دیں۔ جہاں تک ملک کے اندرونی معاملات کا تعلق ہے، شہریت، جیسا کہ عام طور پر اس کی تعلیم دی جاتی ہے، روایاتی بے انصافیوں کو ہمیشہ زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ مثلاً آسودہ حال نوجوانوں کی عظیم اکثریت نے گزشتہ عام ہڑتال کے موقع پر کارخانہ داروں کا ساتھ دینے کو وطن پرستی سے تعبیر

گیا ۔ ان لوگوں میں سے کسی ایک کو بھی بہ مشکل ایسی تعلیم ملی ہوگی جو اسے اس قابل بنا دیتی کہ معاملے کو ہڑتالیوں کی حمایت کے نقطۂ نظر سے دیکھ سکے ۔ جہاں کہیں بھی کسی نا انصافی کا وجود ہے ، اسے درست قرار دینے کے لیے ضابطہ پرستی اور آئین پسندی کے نصب العینوں کی دہائی دی جا سکتی ہے ۔ روس کے سوا باقی تمام ممالک میں تعلیم دینے والے آئینی بزدلی کا عام میلان رکھتے ہیں اور اپنی آمدنی کی خاطر یا شوق اشرافیت کے طفیل اُمرا کے دامن کے ساتھ بندھے رہتے ہیں ۔ دونوں صورتوں میں ان کی تعلیم قانون و آئین کی اہمیت پر ضرورت سے زیادہ زور دیتی ہے جس سے زمانۂ ماضی حال پر اس طرح قابو پا لیتا ہے کہ اسے مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے ۔ اس شدید ضد کا رد عمل یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ دنیا میں اساسی تبدیلی چاہتے ہیں ، انہیں مجبوراً انقلاب پسند ہونا پڑتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ ایک انقلاب پسند کے ذہن میں قومی فرض کا جو تصور ہو ، وہ بھی بالکل ویسا ہی محدود اور انجام کار بالکل ویسا ہی خطرناک ہو جتنا کہ قانون اور ضابطے کی وکالت کرنے والے کا ۔

لیکن بعض صورتیں ضرور ایسی ہیں جہاں اغلب یہ ہے کہ انقلاب پسند رجعت پسند کے مقابلے میں بہتر تعلیم دے گا ۔ پرانے طور طریقوں سے انس رکھنے کے لیے صرف حیوانی جبلتیں ہی کافی ہیں ۔ بالکل اس طرح جیسے سڑک کے اس موڑ پر گھوڑا خود بخود ہی مڑ جایا کرتا ہے ، جہاں وہ عام طور پر مڑا کرتا ہے ۔ قدامت پرستی کے لیے

کسی قسم کے اعلیٰ ذہنی عمل کی ضرورت نہیں ۔ بخلاف اس کے انقلاب پسندوں میں اتنی پرواز فکر کا ہونا ضروری ہے جس کے طفیل وہ موجودہ نظام سے مختلف کوئی تصور قائم کر سکیں ؟ نیز انقلابی میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ حال کو اقدار کے نقطۂ نظر جانچ سکے اور چونکہ وہ اس بات سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ موجودہ نظام کے حامی بھی موجود ہیں ، اس لیے اسے لازمی طور پر یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ کم از کم دو نقطہ ہائے نگاہ ضرور ایسے موجود ہیں ، جن کو کوئی معقول آدمی اختیار کر سکتا ہے ۔ وہ اپنے آپ کو اس بات پر مجبور نہیں پاتا کہ موجودہ نا انصافیوں تلے پسنے والوں پر اپنی ہمدردیوں کے دروازے بند کر دے اور نہ اسے اس بات کی ضرورت ہی پڑتی ہے کہ جن مصائب کی روک تھام آسانی سے ممکن ہے ، ان کی روک تھام نہ کرنے کے لیے دور از کار دلائل تراشتا پھرے ۔ پس زیادہ امکان یہ ہے کہ جو تعلیم موجودہ نظام کے مخالف ہوگی ، وہ موافق تعلیم کے مقابلے میں ذہانت اور ہمدردیوں کو کم کچلے گی ۔

لیکن اس کی بھی کچھ مقررہ حدود ہیں ۔ موجودہ نظام کی مخالفت کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں ، یعنی بد نصیبوں کے ساتھ ہمدردی اور خوش نصیبوں سے نفرت ۔ آخر الذکر حالت میں ہمدردی کا دائرہ اتنا ہی محدود ہوتا ہے جتنا قدامت پرستی کی صورت میں ۔ بہت سے انقلابی ایسے ہیں جنھیں اپنے ہوائی قلعے تعمیر کرتے وقت عوام کی مسرتوں سے اتنا سروکار نہیں ہوتا جتنا اس انتقام سے جو وہ طاقت

اور اختیار کے اُن گستاخ اجارہ داروں سے لینا چاہتے ھیں جو ان کے موجودہ مصائب کے ذمہ دار ھیں۔ انقلاب کے علم برداروں کا عام رجحان یہ ھے کہ وہ ذھنی طور پر اپنے آپ کو مختلف گروہ بندیوں میں منظم کر لیتے ھیں جو ایک محدود عصبیت کے رشتے میں جکڑے ھوتے ھیں اور جدت خیال کو اس بنا پر نا پسند کرتے ھیں کہ ایسی جدت خوش حال گناہ گاروں کے حق میں ایک طرح کی اخلاق غداری ھے۔

تقلید پسندی کی تمام صورتیں فہم و فراست کی موت کے مترادف ھیں۔ چنانچہ اس لحاظ سے انقلابی کی تقلید پسندی رجعت پرست کی تقلید پسندی سے کسی طرح بہتر نہیں۔

فرد کی ثقافت اور شہریت کی تنگ نظرانہ تعلیم میں جو اھم اختلافات ھیں، ان میں سے ایک ''غیر یقینی مسائل کے متعلق سائنسی انداز فکر'' بھی ھے۔ سائنس نے ایک مخصوص تکنیک کو ترقی دی ھے جو بنیادی طور پر انکشاف، یعنی انقلاب کی تکنیک ھے۔ سائنسی انداز فکر کی ایک عام خصوصیت یہ ھے کہ اس سے علمی انکشاف میں آسانی پیدا ھو جاتی ھے اور وہ آدمی کو مجبور نہیں کرتا کہ سائنس کے موجودہ نظریوں پر غیر متزلزل یقین رکھے۔ ایک عام پڑھا لکھا شہری کسی جدید انکشاف کی صلاحیت سے عموماً بے بہرہ ھوتا ھے، کیوں کہ وہ اپنے سے بڑے اور بہتر لوگوں کی عزت اور اسلاف کا احترام کرتا ھے اور تمام ایسے نظریات کو جو موجودہ نظام کو درھم برھم کر دینا

چاہیں ، خوف کی نگاہ سے دیکھتا ہے ، اس لیے جدید ریاست
جس کی بنیاد سائنس پر رکھی گئی ہے ، اپنے آپ کو مشکل
میں پاتی ہے ۔ بعض ریاستیں ایسے غیر مقلد لوگوں کو
پسند کرتی ہیں جو نئے نئے بھک سے آڑ جانے والے مادے
ایجاد کر سکیں ، لیکن بعض اس بات کو ترجیح دیتی ہیں
کہ ان کے نوجوان تقلید پسند ہوں ، تاکہ ماضی کی
عظیم الشان روایات زندہ و قائم رہیں ۔ باز نطینیوں نے اس
حالت میں جب وہ مغربی ممالک کی امداد چند مذہبی رعایات
دے کر خرید سکتے تھے ، اپنی مذہبی عصبیت کی نگہداشت
کو ضروری خیال کیا اور ترکوں کے ہاتھوں شکست
کھائی ۔ اسی طرح جب برطانوی بحریہ کو یہ خوفناک
انتخاب کرنا پڑتا ہے کہ یا تو وہ انقلاب پسند نوجوانوں
کی باتوں پر کان دھرے اور یا نیلسن کے ساتھ عقیدت مندی
کے طفیل از کار رفتہ ہو کر رہ جائے تو وہ آخری صورت کو
ترجیح دیتا ہے ، خواہ اسلاف کی روایات کے اس احترام
میں اسے کتنی ہی مصیبتوں کا سامنا کیوں نہ کرنا
پڑے ۔ یہ کم از کم ان کا قول ہے جو حقیقت حال سے
آگاہ نہیں ۔

عہد حاضر کا یہ عجیب تناقض ہے کہ سائنس جو طاقت
اور قوت کا سر چشمہ ہے اور خصوصیت سے ریاست کی طاقت
اور قوت کا — اس کی نشو و نما کا تقاضا یہ ہے کہ
تحقیق کنندہ کے دل و دماغ پر لازماً نراجی کیفیت طاری
رہے ۔ سائنسی انداز فکر نہ تو متشکک ہو سکتا ہے اور
نہ مقلد ، کیوں کہ متشکک کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقت

ناقابلِ انکشاف ہے اور مقلد کے خیال میں حقیقت کی دریافت پہلے ہی ہو چکی ہوتی ہے ، لیکن سائنس کے طالب علم کا نظریہ یہ ہے کہ حقیقت کی دریافت ممکن ہے ، گو ابھی تک کم از کم ان مسائل میں اس کی دریافت باقی ہے ، جن کی تحقیق میں وہ مصروف ہے ؛ لیکن صرف یہ کہہ دینا کہ حقیقت کا انکشاف ممکن ہے ، ایک حقیقی سائنس دان کے یقین سے کچھ زیادہ ہے ، کیوں کہ وہ اپنے انکشافات کو آخری اور قطعی خیال نہیں کرتا ، بلکہ انھیں ایسے تخمینے جانتا ہے جن کی درستی مستقبل میں ہو سکتی ہے ۔ قطعیت کا فقدان ہی سائنسی روح کا خلاصہ ہے ۔ سائنسی علما کے عقائد استدلالی ہوتے ہیں ، لیکن جہاں تک ان عقائد کا انحصار ان کی تحقیقات پر ہوتا ہے ، انھیں ذاتی اور شخصی کہا جا سکتا ہے ، نہ کہ معاشری ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان عقائد کا مدار سائنس دان کے اپنے مشاہدات و نتائج پر ہوتا ہے ، نہ کہ اس بات پر کہ معاشرہ کن باتوں کو اچھے شہریوں کے لیے معقول خیال کرتا ہے ۔ سائنسی مزاج اور حکومتی استعمال ، سائنس کا یہ تضاد سائنسی ترقی کو انجام کار یک قلم روک دے گا ، کیوں کہ سائنسی تکنیک کو پیش از پیش تقلید پرستی اور زود اعتقادی کی اشاعت کے لیے استعمال کیا جائے گا ۔ اگر مطلوب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو تو یہ ضروری ہوگا کہ جن لڑکوں میں ایک خاص حد تک سائنس کی طرف فطری میلان پایا جائے ، انھیں شہریت کی مقررہ تربیت سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور سوچنے کی کھلے بندوں اجازت دے دی جائے ۔ جو اشخاص امتحان

میں ایک خاص مقام حاصل کر لیں ، انھیں اپنے نام کے بعد "س - ا" لکھنے کی اجازت ہونی چاہیے - ان حروف کا مطلب ہوگا 'سوچنے کی اجازت' - ایسے لوگ کسی عہدے کے لیے بھی محض اس بنا پر غیر موزوں نہیں سمجھے جائیں گے کہ وہ اپنے افسروں کو احمق سمجھتے ہیں -

e اگر مزید سنجیدگی سے بات کی جائے تو حقیقت کا تصور ہی کچھ ایسا ہے کہ وہ شہریت کے معمولی نصب العین سے مطابقت پیدا ہی نہیں کر سکتا - بے شک یہ کہا جا سکتا ہے ، جیسا کہ نظریۂ عملیت کے فلسفیوں کا قول ہے کہ روایتی شکل میں تصور حق کا کوئی جواز نہیں اور حق صرف اسی چیز کا نام ہے جس پر اعتقاد رکھنا باعث سہولت ہو - اگر حقیقت حال یہی ہو تو حقیقت کی تعبیر پارلیمانی قوانین کے ذریعے سے کی جا سکتی ہے - لی ہنٹ (Leigh Hunt) کو یہ باور کرنے میں تکلیف ہوتی تھی کہ قائم مقام بادشاہ موٹا تھا ، کیوں کہ اس یقین ہی نے اسے جیل خانے میں ڈال دیا تھا - اس کا مطلب یہ ہوا کہ بادشاہ موصوف دبلا تھا - ظاہر ہے کہ ایسے معاملات میں عملیت کے فلسفے کو قبول کرنا مشکل ہے - اس یقین سے مفر دشوار ہے کہ نفس الامری اور قطعی طور پر اس مسئلے میں صداقت موجود ہے کہ قائم مقام بادشاہ موٹا تھا - بے شک میرے ذہن میں کئی دلائل ہو سکتے ہیں جو اس نتیجے سے بچنے کے لیے گھڑے جا سکتے ہیں - مٹاپا ایک اضافی مفہوم ہے - مجھے یاد ہے کہ جب کرائسٹ سکول کے آنجہانی ماسٹر نے جنھیں کسی حالت میں چھوٹا

آدمی نہیں کہا جا سکتا ، ایک دعوت کے موقع پر اپنے آپ کو عہد حاضر کے دو جلیل القدر انشا پردازوں کے درمیان بیٹھے ہوئے پایا تو بول اٹھے ''آج مجھے دبلا محسوس ہونے کا غیر معمولی تجربہ حاصل ہو رہا ہے'' شاید قائم مقام شاہزادے کو انعامی مقابلے میں شریک ہونے والے سواروں کی نسبت سے کہا جا سکے کہ وہ دبلا ہے ، اسی لیے لی ھنٹ کے بیان کو درست ظاھر کرنے کے لیے یہ کہنا پڑے گا کہ شاھزادۂ موصوف ایک فی صدی موٹے بالغ مردوں کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا یا اس طرح کا کوئی اور فقرہ وضع کرنے کی ضرورت پڑے گی ۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاھزادۂ موصوف کا وزن اس کے قد کی نسبت سے ملک معظم کی رعایا کے تمام بالغ مردوں میں ایک فی صدی کے سوا سب سے زیادہ ہے ۔ ممکن ہے اس بیان میں شبہے کی گنجائش موجود ہو ۔ اگر ایسا ہو تو ایک فی صدی کے بجائے دو فی صدی رکھ کر ہم اسے بالکل یقینی طور پر درست بنا سکتے ہیں ۔ سنجیدگی کے ساتھ یہ تسلیم کرنا بڑا ھی مشکل ہے کہ یہ قول اس لیے درست ہے کہ اس کا تسلیم کر لینا باعث سہولت ہے یا یہ اس لیے غلط ہے کہ اس کا زبان سے نکالنا جرم ہے ۔ میں نے ایک ایسے واقعے کا انتخاب کیا ہے جو آج سے ایک صدی پیشتر واقع ہوا اور جو سیاسی جذبات کو بر انگیختہ نہیں کر سکتا ۔ عہد حاضر میں اسی قسم کے کئی معاملات ایسے ہیں جو حکومتوں کے لیے دل چسپی کا باعث ہیں ۔ ابھی ایسے بہت سے مسائل موجود ہیں جن سے کوئی سائنس فکر

کا انسان انکار نہیں کر سکتا ، لیکن جنہیں کوئی ایسا شخص زبان پر نہیں لاتا جسے قید خانے سے باہر رہنا مطلوب ہے۔ دنیا کی تمام حکومتیں ایسی صداقتوں کو چھپانے کے لیے جن کا اظہار ان کے نزدیک غیر پسندیدہ ہو ، بہت لمبے چوڑے طریقے اختیار کرتی ہیں اور ان لوگوں کو طرح طرح کی سزائیں دیتی ہیں جو ایسے علم کی اشاعت کرتے ہیں جسے عوام کے لیے برا خیال کیا جاتا ہے۔ اس چیز کا اطلاق اس علم پر خصوصیت سے ہوتا ہے جسے باغیانہ یا عریاں تصور کیا جاتا ہے۔ میں کوئی مثال پیش نہیں کروں گا ، کیوں کہ اگر ایسا کروں تو میں خود قانون کی زد میں آ جاؤں گا۔

ان وجوہ کی بنا پر جن کو ہم دیکھ چکے ہیں ، شہریت کی تعلیم میں شدید خطرے موجود ہیں ، تاہم ایسی تعلیم کے حق میں جس کا منشا معاشری یک جہتی پیدا کرنا ہو ، بہت وزنی دلائل موجود ہیں۔

متمدن زندگی کی سہولتوں کا مدار تعاون پر ہے اور صنعت کاری کی ہر پیش قدمی پہلے سے زیادہ تعاون کا مطالبہ کرتی ہے۔ مثلاً چین میں خوش حالی اور اعلیٰ تمدن کے تمام ضروری اسباب سوائے ایک مضبوط مرکزی حکومت کے موجود ہیں۔ جنوبی امریکہ جب سے سپین اور پرتگال کے جوئے سے آزاد ہوا ہے ، اہل ملک کے نراجی میلان طبع کی وجہ سے ترقی کے میدان میں پیچھے رہ گیا ہے۔ بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ بھی لاطینی امریکی ریاستوں کے نقش قدم پر چلنے کی تیاری

کر رہا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ کے اکثر باشندوں میں شہریت کے ایک واضح مفہوم کا فقدان یقیناً سب سے بڑا خطرہ ہے جو اس وقت ریاست ہائے متحدہ کو در پیش ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہاں تعلیم میں شہریت پر زور نہیں دیا جا رہا ہے، بلکہ اس کے برعکس امریکہ میں تو پبلک سکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک سارا تعلیمی نظام شہریت پر زور دینے اور اس کے فرائض کو نوجوانوں کے دلوں میں جاگزین کرنے کے لیے فکر مند ہے۔ باوجود ان تعلیمی مساعی کے ایک عام امریکی شہری میں وہ فطری سماجی احساس ہی نہیں پایا جاتا جو یورپ کے پرانے ممالک میں موجود ہے۔ اس کی وجہ یا تو اولین لوگوں کی روایات ہیں اور یا یہ کہ ان کے قریبی زمانے کے باپ دادا در اصل یورپ کے باشندے تھے۔ جب تک وہ یہ چیز حاصل نہیں کر لیتا، اس امر کا خطرہ موجود ہے کہ تمام صنعتی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

حدود ریاست کے اندر ملّی شیرازہ بندی کے علاوہ جو اس وقت سرکاری نظام تعلیم کا واحد نصب العین ہے، بین الاقوامی ہم آہنگی اور یہ احساس کہ تمام انسانی نسلیں ایک متعاون وحدت ہیں، ہماری سائنسی تہذیب کی بقا کے لیے روز بروز زیادہ ضروری ہوتے جا رہے ہیں۔ میری رائے میں اس تمدن کی بقا اولاً تو ہم سے کم از کم ایک عالم گیر ریاست کے قیام کا تقاضا کرتی ہے اور ثانیاً ایک ایسے عالم گیر نظام تعلیم کا جو ہم میں اس عالم گیر ریاست کے ساتھ وفاداری کا جذبہ پیدا کرے۔ بلا شبہ ایسا

نظام کوئی صدی دو صدی تک بعض ایسے غیر ملائم حالات پیدا کرے گا جو انفرادی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوں گے، لیکن اگر اس کی متبادل صورت افرا تفری اور تہذیب و تمدن کی مکمل موت ہے تو یہ قیمت ادا کرنا کوئی بڑا سودا نہ ہوگا۔ موجودہ اقوام عالم اپنے اسلاف کے مقابلے میں سیاسی اور معاشی لحاظ سے زیادہ یک جہتی کی حامل ہیں۔ ان کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ان کے افراد خواہ مرد ہوں یا عورت، اسی نسبت سے قوی تر جذبۂ شہریت کے مالک ہوں۔ بلا شبہ عالم گیر ریاست سے وفاداری کا جذبہ ان بد ترین پہلوؤں سے پاک ہوگا جو موجودہ ریاستوں کی وفاداری کا خاصہ ہیں اور جن کا منشا ہی جنگ کی حوصلہ افزائی ہے، لیکن بہت ممکن ہے کہ اس سے علمی اور جمالیاتی امنگوں میں کافی حد تک کمی ہو جائے، تاہم میرا خیال ہے کہ مستقبل قریب کی اہم ترین ضرورت یہ ہوگی کہ عالم گیر شہریت کے ایک بین جذبے کی ترتیب کی جائے۔ جب ایک دفعہ ساری دنیا بہ حیثیت ایک سیاسی اور معاشی وحدت کے محفوظ ہو گئی تو انفرادی ثقافت کا احیا ممکن ہو جائے گا، لیکن اس وقت کے آنے تک ہماری ساری تہذیب سخت خطرے میں ہے۔ ہر دو متبادل صورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے میرے خیال میں فرد کی تعلیم شہری کی تعلیم سے ایک عمدہ تر شے ہے، لیکن سیاسی زاویۂ نگاہ سے زمانے کی ضروریات کے پیش نظر مجھے خوف ہے کہ شہری کی تعلیم کو پہلا درجہ دینا ہوگا۔

باب دوم

تعلیم کا سلبی نظریہ

عہد حاضر میں تعلیم کے تین مختلف نظریے ہیں اور تینوں کے حامی موجود ہیں ۔ ان میں سے پہلی جماعت کا یہ خیال ہے کہ تعلیم کا مقصد وحید ترقی کے مواقع بہم پہنچانا اور رکاوٹوں کا ہٹانا ہے ۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ افراد کو ثقافت سے بہرہ ور کرنا اور اُن کی تمام استعدادوں کو انتہائی نقطے تک تربیت دینا ہی تعلیم کی غایت ہے ۔ شہری جماعت کہتی ہے کہ تعلیم پر فرد کے زاویۂ نگاہ سے غور کرنے کے بجائے اجتماعی زاویۂ نگاہ سے غور کرنا چاہیے اور اس کا کام یہ ہونا چاہیے کہ مفید شہریوں کی تربیت کرے ۔ ان نظریوں میں پہلا سب سے نیا اور تیسرا سب سے پرانا ہے ۔ دوسرا اور تیسرا نظریہ جن پر ہم پہلے باب میں بحث کر چکے ہیں ، اس بات پر متفق ہیں کہ تعلیم کا ایجابی پہلو بھی ہے ، مگر پہلے نظریے کی رو سے اس کا عمل صرف سلبی ہے ۔ فی الواقع کہیں ایسی تعلیم نہیں دی جاتی جو اُن تینوں نظریوں میں سے بالکل مکمل طور پر کسی ایک کے مطابق ہو ، بلکہ یہ تینوں نظریے کم و بیش ان تمام نظام ہائے تعلیم

میں موجود ہیں جو حقیقۃً مروج ہیں ۔

میرے خیال میں یہ بات خاصی واضح ہے کہ ان تینوں نظریوں میں سے فی نفسہ کوئی بھی کافی نہیں اور ایک درست نظام تعلیم کا انتخاب بہت حد تک اس امر پر منحصر ہے کہ تینوں نظریے موزوں تناسب سے اپنا لیے جائیں ۔ گو میری رائے میں پہلے نظریے میں جسے ہم تعلیم کا سلبی نظریہ کہتے ہیں ، زیادہ صداقت پائی جاتی ہے ، لیکن میرے خیال میں یہ کسی طرح بھی پوری سچائی کا حامل نہیں ۔ تعلیم کے بارے میں جو سوچ بچار ہوا ہے ، اس پر زیادہ تر سلبی نظریہ ہی چھایا ہوا ہے اور یہ اسی عام مسلک کا ایک حصہ ہے جس نے روسو کے وقت سے انسانی ذہن میں آزادیٔ خیال کی روح پھونکی ہے ۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ سیاسی حریت پسندی کو لازمی تعلیم کے عقیدے کے ساتھ وابستگی رہی ہے ۔ تعلیمی آزادی کا عقیدہ بہت بڑی حد تک اشتراکیوں ، بلکہ اشتمالیوں میں بھی پایا جاتا ہے ۔ باوجود اس کے تصوراتی طور پر یہ عقیدہ حریت پسندی سے مربوط ہے اور اس میں سچ اور جھوٹ اسی حد تک موجود ہے جس حد تک کہ دوسرے شعبوں کے متعلق تصور آزادی میں پایا جاتا ہے ۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا ، لوگ عام طور پر متفق تھے کہ تعلیم کا کام بچے کو اس ڈھب کی تربیت دینا ہے جس پر اسے زندگی میں چلانا مقصود ہو ۔ اسے اخلاق اصولوں ، جفا کشی کی عادات اور اس کے

سماجی رتبے کے حسب حال علم کی کچھ مقدار کا سکھانا ضروری سمجھا جاتا تھا ۔ جن طریقوں سے یہ مقاصد حاصل کیے جاتے تھے ، وہ بھدے تو تھے ، مگر ان سے کام چل جاتا تھا ۔ وہ قریب قریب انھی طریقوں سے ملتے جلتے تھے جو گھوڑوں کو سدھانے کے لیے استعمال کیے جاتے ھیں ۔ جو کام گھوڑوں کے لیے کوڑا سر انجام دیتا ہے ، وھی خدمت بچے کے لیے ڈنڈے سے لی جاتی ۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ نظام اپنے بھونڈے پن کے باوجود مجموعی حیثیت سے پیش نظر نتائج پیدا کرنے میں کامیاب رھا ۔ اگرچہ ایک اقلیت ھی نے تعلیم حاصل کرنا گوارہ کیا ، لیکن اس اقلیت میں بعض عادات ، مثلاً ضبط نفس ، معاشرتی ھم آھنگی ، صلاحیت قیادت اور انسانی ضرورتوں سے بے نیاز درشت مزاجی کی عادات راسخ ھو گئیں ۔ جن لوگوں نے ڈاکٹر کیٹ (Keate) اور اس جیسے دوسرے پادری منش لوگوں سے تربیت پائی ، انھی نے ھمارے انگلستان کو موجودہ شکل دی اور ھماری تہذیب کی برکات کو ھندوستان اور افریقہ کے تاریک خیال کافروں تک پھیلا دیا ۔ میں اس کارنامے کو کم کر کے نہیں دکھانا چاھتا اور نیز مجھے اس کا بھی یقین نہیں کہ کسی اور طریقے پر عمل کر کے اتنی تھوڑی مدت میں یہ کامیابی ممکن تھی ۔ جو لوگ اس طریقے کی پیداوار تھے ، چونکہ ان میں اہل سپارٹا کی سی سخت جانی پائی جاتی تھی ، اور وہ مکمل طور پر عقلی شبہات کی اھلیت سے محروم

تھے ، اس لیے ان میں وہ اوصاف پیدا ہو گیے تھے جو پس ماندہ اقوام کی حکمران قوم کے لیے درکار تھے۔ انھوں نے اسی شدید ضبط و نظم کو رائج کیا جس کے ماتحت ان کا اپنا بچپن گزرا تھا اور وہ اس احساس سے بچ گئے کہ جس چیز کو وہ تعلیم کا نام دیتے ہیں ، اس نے ان میں محض تصمیم عزم پیدا کرنے کی خاطر آن کے جذبات اور آن کی فراست کو مفلوج کر رکھا ہے۔ امریکہ میں پیورٹن (Puritan) تحریک سے ، جب تک وہ زوروں پر رہی ، یہی نتائج برآمد ہوئے۔

رومانی تحریک کا مطلب لازماً یہ تھا کہ جذبات کے نام پر قوت ارادی کی سابقہ غیر ضروری اہمیت کے خلاف احتجاج کیا جائے۔ رومانی تحریک نے بہت چھوٹے بچوں سے سلوک کے بارے میں کچھ نہ کچھ کامیابی حاصل کی ، لیکن بہت حد تک محکمۂ تعلیم کے ارباب اختیار کچھ اس مضبوطی سے اپنے مورچوں میں ڈٹے بیٹھے تھے اور حکمرانی کی عادت ان کی طبیعتوں میں اس قدر پختہ ہو چکی تھی کہ وہ رومانی تحریک کے لطیف مقاصد سے نمایاں طور پر متاثر نہ ہو سکے۔ یہ صرف ہمارے زمانے ہی میں ہوا کہ زندگی کے بارے میں ان کے عام زاویہ ہائے نگاہ سے نظریۂ تعلیم پر وسیع اور حقیقی اثرات مترتب ہونے لگے ، لیکن جس طرح معاشیات میں عدم مداخلت کی پالیسی کو منظم منصوبہ بندی کے سامنے سر جھکانا پڑا ، اسی طرح تعلیم میں بھی ہوا۔ میرے خیال میں بھی سرکاری عدم مداخلت

گو ایک ضروری مرحلہ ہے ، تاہم اسے قطعی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ میں اس باب میں اول اس عدم مداخلت کے حق میں کچھ کہنا چاہتا ہوں اور پھر اس کی حدود کا جائزہ لوں گا۔

تعلیم میں حتی الامکان زیادہ سے زیادہ آزادی دینے کا معاملہ بہت قوی دلائل پر مبنی ہے۔ اول یہ کہ آزادی کے فقدان سے بالغوں کے ساتھ تصادم کا اندیشہ ہے جس کے نفسیاتی اثرات اکثر اس سے کہیں زیادہ دور رس ہوتے ہیں جتنے اب تک سمجھے جاتے رہے ہیں۔ جس بچے پر کسی طرح کا دباؤ ڈالا جاتا ہے ، اس کے ذہن میں لازماً نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اگر وہ عام حالات کے مطابق آزادی سے نفرت کا اظہار نہ کر سکے تو اس کا ذہن ایسی زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے جو ممکن ہے نیم شعور میں جاگزیں ہو کر عمر بھر عجیب و غریب نتائج کا موجب بنتی رہیں۔ بچے کو باپ کی ذات سے جو نفرت پیدا ہوئی تھی ، ممکن ہے کہ وہ ریاست ، مذہب یا کسی غیر ملکی قوم کی طرف منتقل ہو جائے اور اس طرح کوئی انسان حالات کے مطابق نراجی ، ملحد یا جنگ جو بن جائے ، یا پھر جو لوگ بچے پر تشدد کرتے ہیں ، ان کے خلاف جذبۂ نفرت اس خواہش میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے کہ بعد میں آنے والی نسلوں پر اتنا ہی تشدد کیا جائے۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دل میں صرف ایک عام روکھا پن پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے

انفرادی اور سماجی تعلقات کا خوش گوار ہونا ناممکن ہو جائے۔ میں نے ایک دفعہ اسکول میں ایک درمیانہ قد کے لڑکے کو دیکھا جو ایک چھوٹے سے بچے سے بد سلوکی کر رہا تھا۔ میں نے اسے تنبیہ کی، مگر وہ کہنے لگا "مجھ سے بڑے مجھے پیٹتے ہیں، اس لیے میں ننھے بچوں کو پیٹتا ہوں، یہ مناسب بھی ہے۔" ان الفاظ میں اس نے انسانیت کی ساری تاریخ کا نچوڑ پیش کر دیا۔

تعلیم میں جبر کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ یہ طالب علم کی اپج اور ذہنی شغف کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ نوجوانوں میں علم کی خواہش (کم از کم اچھے خاصے علم کی خواہش) کا ہونا قدرتی ہے، لیکن یہ خواہش اس لیے مر جاتی ہے کہ انہیں خواہش سے زیادہ یا ان کی قوت جاذبہ سے زیادہ دیا جاتا ہے۔ جن بچوں کو جبراً کھلایا جاتا ہے، انہیں کھانے سے نفرت ہو جاتی ہے اور جن کو جبراً پڑھایا جاتا ہے، وہ علم سے اکتا جاتے ہیں۔ جب وہ سوچتے ہیں تو فطری طریق پر نہیں سوچتے، جیسے مثلاً وہ بلا ارادہ دوڑتے کودتے اور چیختے چلاتے ہیں۔ وہ صرف اس خیال سے سوچتے ہیں کہ انہیں کسی بالغ کو خوش کرنا ہوتا ہے، اس لیے ان کی کوشش درستی پر مبذول ہوتی ہے جس میں فطری ذوق جستجو کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ فنون لطیفہ کی تربیت میں بالخصوص قوت آمد کا خاتمہ بڑا ضرر رساں ہوتا ہے۔ جن بچوں کو ادب، مصوری یا موسیقی کی ضرورت سے زیادہ

تعلیم دی جاتی ھے، یا جنھیں خود اظہاری کے بجائے درستی کا خیال پیش نظر رھتا ھے، وہ آھستہ آھستہ زندگی کے جمالیاتی پہلو سے دل چسپی لینا چھوڑ دیتے ھیں، بلکہ بہت زیادہ ھدایات دینے سے میکانیکی ایجادات سے بھی بچے کی دلچسپی کا خاتمہ ھو جاتا ھے۔ اگر آپ کسی لڑکے کو سبق کے دوران میں عام نلکوں کا اصول سمجھائیں تو جو کچھ آپ اُسے بتانا چاھتے ھیں اُسے سیکھنے سے جی چرائے گا، لیکن اگر آپ کے مکان کے پچھواڑے، نلکہ لگا ھے اور آپ نے اُسے چھونے سے منع کر دیا ھے تو وہ فرصت کا تمام وقت اس پر غور کرنے میں صرف کر دے گا۔ بہت سی ایسی دقتیں سبق کو اختیاری کر دینے سے رفع ھو سکتی ھیں۔ اس طرح اُستاد اور شاگرد میں بگاڑ کا سوال ھی اُٹھ جائے گا اور اکثر حالات میں شاگرد استاد کی بتائی ھوئی باتوں کو قابل توجہ سمجھیں گے۔ اُن کی قوت اختراع تباہ نہیں ھوگی، کیوں کہ وہ اپنی مرضی سے پڑھیں گے، نیز غیر ھضم شدہ نفرت کے وہ ڈھیر جو اُن کے لا شعور میں عمر بھر کے لیے پڑے سڑتے رھتے ھیں، جمع نہیں ھونے پائیں گے۔ آزادیٔ تقریر، مجلسی تکلفات سے چھٹکارا پانے اور جنسی تعلیم کی آزادی کے حق میں زیادہ زبردست دلائل موجود ھیں جن پر ھم بعد میں الگ بحث کریں گے۔

ان تمام وجوہ کی بنا پر تعلیمی مصلحین کا رجحان یہ ھے اور میرے خیال میں وہ حق بجانب بھی ھیں کہ

سکولوں میں زیادہ سے زیادہ آزادی ہونی چاہیئے۔ بہر حال میرا یہ خیال نہیں کہ سکولوں میں آزادی کو بطور ایک قطعی اصول کے قائم کردیا جائے۔ اس کی کچھ حدود ہیں اور یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ وہ کیا ہیں۔

ایک نہایت واضح مثال کے طور پر ہم صفائی کو لے سکتے ہیں ۔ اولاً میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آسودہ حال والدین کے بچوں کو ضرورت سے زیادہ صاف ستھرا رکھا جاتا ہے۔ والدین اپنے اس رویے کے لیے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ صفائی مفید صحت ہے، لیکن اس بہت زیادہ اہتمام کا اصل محرک اظہار امارت کا جذبہ ہے۔ اگر آپ دو بچوں کو دیکھیں جن میں ایک صاف ستھرا اور دوسرا گندا ہو تو آپ میں اس خیال کا میلان پیدا ہوگا کہ صاف ستھرے بچے کے والدین کی آمدنی گندے بچے کے والدین سے زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے امارت پرست لوگ اپنے بچوں کو غیر معمولی طور پر صاف ستھرا رکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ ایک قابل نفرت ظلم ہے جو بچوں کے بہت سے ایسے مشاغل میں رکاوٹ ڈالتا ہے جو ان کے لیے مفید ہیں۔ صحت کے زاویۂ نگاہ سے یہ ضرور اچھا ہے کہ بچوں کو دن میں دو دفعہ نہلا دھلا دیا جائے۔ ایک دفعہ جب وہ صبح کو جاگیں اور دوسرے جب وہ رات کو سونے لگیں۔ ان دو تکلیف دہ لمحات کے درمیانی وقت میں انہیں چاہیئے کہ دنیا اور اس کے ناصاف حصوں کی دیکھ بھال اور چھان

پن میں لگے رہیں ، اپنے کپڑوں کو خراب کریں اور کیچڑ سے لتھڑے ہاتھ منہ پر ملیں ۔ بچوں کو ان مسرتوں سے محروم کرنا ، ان کی قوتِ اختراع اور ذوق جستجو کو کم کرنا اور اپنے اعضا و عضلات کا استعمال سیکھنے سے محروم کرنا ہے ۔ اگرچہ میلا پن اتنی مفید چیز ہے لیکن صبح اور شام کی صفائی کو بھی ایک مقرر مقام حاصل ہے ، تاہم بچے کی زندگی میں اسے یہ محدود مقام بھی کافی جبر کے بغیر نہ مل سکے گا ۔ اگر ہم کپڑے نہ پہنیں اور ایک گرم ملک کے باشندے ہوں تو جسم کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی میں داخل ہو کر ہاتھ پاؤں مارنے ہی سے صفائی کی ضرورت پوری ہو جائے ، بلا شبہ انسان نما بندر نے ایسا ہی انتظام کر رکھا تھا لیکن ہم لوگ جو کپڑے پہننے کے عادی ہیں اور معتدل آب و ہوا میں رہتے ہیں ، ہمیں صفائی کا وجدانی احساس اتنا نہیں ہے جتنا صحت کے لیے ضروری ہے ، اس لیے لازم ہے کہ ہمیں نہانے دھونے کی تعلیم دی جائے ۔ یہی حال دانتوں کو مسواک سے صاف کرنے کا ہے ۔ اگر ہم اپنے قدیم الایام اسلاف کی طرح کچی اشیا کھا رہے ہوتے تو مسواک کی ضرورت ہی پیش نہ آتی ، لیکن جب تک ہم پکا کر کھانے کی غیر فطری عادت کو باقی رکھیں گے ہمیں اس کا توڑ ایک دوسری غیر فطری عادت ، یعنی مسواک سے کرنا ہوگا ۔ اگر "فطرت کی طرف واپس چلو" کے مسلک کو اصول صحت سے ہم آہنگی ہوتا ہے تو اسے

ہر طرح مکمل ہونا چاہیے اور کپڑے اتار پھینکنا اور زیندھنے پکانے سے چھٹکارا پانا بھی اس مسلک میں شامل ہونا چاہیے ۔ اگر ہم اس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ہمیں بچوں کو بعض ایسی عادات سکھانی پڑیں گی جنھیں وہ از خود نہیں سیکھ سکتے ۔ پس اگرچہ ہماری رسمی تعلیم نے صفائی اور تندرستی کے معاملات میں ہماری آزادی کو ضرورت سے زیادہ محدود کر رکھا ہے ، تاہم مفاد صحت کے پیش نظر کچھ نہ کچھ پابندی ضروری ہے ۔

ایک دوسرا معمولی سا وصف جو شاید مکمل آزاد تعلیم کی فضا میں نہ پنپ سکے ، پابندیٔ وقت ہے ۔ پابندیٔ وقت ایسی خوبی ہے جس کی ضرورت سماجی تعاون کے ساتھ وابستہ ہے ۔ اس کا نہ تو خدا اور انسانی روح کے تعلق سے کوئی واسطہ ہے اور نہ باطنی بصیرت ہی سے اور نہ ان معاملات سے جن سے زیادہ بلند مرتبہ اور روحانیت پرست اخلاق معلموں کو واسطہ پڑتا ہے ۔ ایک صوفی کو شراب پیتے دیکھ کر آدمی متعجب ہوتا ہے لیکن اگر وہ کسی جگہ طے شدہ وقت پر نہ پہنچ سکے تو کسی کو بھی تعجب نہیں ہوتا حالانکہ زندگی کے عام کار و بار میں پابندیٔ وقت سخت ضروری ہے ۔ اگر ایک انجن چلانے والا یا ایک ڈاکیہ اس وقت کا انتظار کرے جب اس کی ترنگ اسے انجن چلانے یا خطوط تقسیم کرنے کے لیے ابھارے تو اس طرح کام نہیں چل سکتا ۔ اگر پیچیدہ معاشی اداروں کے متعلقہ کارکن اپنے کام پر اکثر دیر سے پہنچنے لگیں تو وہ تمام ادارے ناقابل عمل

بن جائیں ، لیکن پابندیٔ وقت کی عادات ایک آزاد فضا میں بہ مشکل سیکھی جا سکتی ہیں ۔ یہ عادات ایسے شخص میں راسخ نہیں ہو سکتیں جو کیفیت مزاج کو اپنے اوپر چھا جانے کی اجازت دے دے ؟ غالباً اسی لیے یہ عادات عظیم الشان کارناموں سے ہم آہنگی نہیں پیدا کر سکتیں ۔ نیوٹن جیسا کہ ہمیں معلوم ہے ، کھانے کے بارے میں اتنا غیر پابند اوقات تھا کہ کتا اس کا کھانا کھا جایا کرتا تھا اور اسے خبر بھی نہ ہونے پاتی تھی ۔ اکثر شعبوں میں عظیم الشان کارنامے سر انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کسی ایک کیفیت مزاج میں کھو جانے کی اہلیت رکھتا ہو ، لیکن جن لوگوں کے کاروبار غیر فنی نوعیت کے ہیں ، اگر وہ عادتاً غیر پابند وقت ہوں گے تو خواہ وہ بادشاہ ہوں یا اس سے کم درجے کے لوگ ، وہ بہت نقصان پیدا کریں گے ، اس لیے یہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہمارے نوجوانوں کو دور حاضر کی زندگی میں کوئی معمولی کردار ادا کرنے کے لیے موزوں بنانا ہے تو انھیں مقررہ کام مقررہ اوقات پر بجا لانے پر مجبور کیا جائے ۔ جو لوگ شاعر یا اہل قلم اور ریاضی دان کی حیثیت سے غیر معمولی قابلیت کا اظہار کریں ، انھیں اس پابندی سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے ، لیکن پابندیٔ وقت کے سلسلے میں باقی ننانوے فی صد لوگوں کا ضبط میں سے گزرنا ضروری ہے ، کیوں کہ اگر انھیں آزادی سے فطری ترنگ کی پیروی ہی میں پروان چڑھنے دیا گیا ، تو یہ پابندی ناممکن ہو جائے گی ۔ ہم

خیال کرتے ہیں کہ شریف النفس وحشی اس وقت شکار کے لیے نکلتا تھا جب اسے بھوک لگتی تھی ، نہ کہ اپنے ان جانشینوں کی طرح جو شہر کے نواح میں بستے ہیں ، صبح کے آٹھ بج کر ترپن منٹ پر کمر بستہ ہو کر کام پر روانہ ہو جاتے ہیں ؛ اسی لیے جو تعلیم شریف النفس وحشی کے لیے ہو سکتی ہے وہ شہر کے مضافات میں بسنے والے کی تمام ضرورتیں پوری نہیں کر سکتی ۔ ایک اور سنگین معاملہ جس پر اسی قسم کی مصلحتوں کا اطلاق ہوتا ہے ، دیانت داری ہے ۔ اس اصطلاح سے میری مراد کوئی تخیلی مفہوم نہیں ، میرا مطلب دوسروں کے مال کا احترام ہے ۔ یہ انسانوں کا فطری خاصہ نہیں ، ایک غیر تربیت یافتہ انسان دوسروں کے مال کو جب اسے کوئی خطرہ نظر نہ آئے ، ہتھیا لیا کرتا ہے ۔ غالباً ایک تربیت یافتہ آدمی بھی اکثر ایسا کر لیتا ہے لیکن ضبط نے اسے یہ بات سکھا دی ہے کہ چوری گو بادیٔ النظر میں خطرے سے خالی دکھائی دیتی ہے لیکن اکثر خالی از خطرہ نہیں ہوتی ۔ میرے خیال میں عہد حاضر کے بعض انسانیت دوست لوگوں کے دماغ میں اس مفہوم کے متعلق ایک خاص الجھن پائی جاتی ہے ۔ یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ جنون سرقہ بھی ایک چیز ہے ، وہ ہر چوری کو جنون سرقہ کا نام دے دینے کی طرف مائل ہیں ، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے ۔ جنون سرقہ ایسی اشیا کی چوری ہوتی ہے جو اکثر فی الواقع چور کے کام کی نہیں ہوتیں ، نیز چوری کا ارتکاب ایسے حالات میں

کیا جاتا ہے جہاں پکڑا جانا خاصا یقینی ہو؛ عموماً اس کی علت نفسیاتی ہوتی ہے۔ جنون سرقہ کا مریض غیر شعوری طور پر محبت یا جنسی اہمیت کی چیزوں کو چراتا ہے۔ جنون سرقہ کا علاج سزا سے نہیں، بلکہ نفسیاتی فہم سے کیا جا سکتا ہے، لیکن عام چوری کسی حالت میں بھی غیر شعوری نہیں ہوتی اور چونکہ یہ سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے اس لیے سماجی سزاؤں کے ذریعے اسے ذاتی مفاد کی ضد بنا کر روکا جا سکتا ہے۔ بچوں کی ایسی جماعت میں جہاں ان کے بزرگ انہیں آزاد چھوڑ دیں، جو بچہ چوری کرے گا، بشرطیکہ وہ اس گروہ میں سب سے بڑا نہ ہو، باقی بچوں کے ہاتھوں بری طرح پٹے گا۔ بڑی عمر کے لوگ اس سزا سے بے تعلقی کا اظہار کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ ان کے نظام میں کوئی تعزیری ضابطہ نہیں لیکن وہ اس میں خود فریبی کے مجرم ہوں گے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ جو تعزیری ضابطہ بچوں کا ایک گروہ از خود بنائے گا، وہ بڑوں کے ایجاد کردہ ضابطے کے مقابلے میں زیادہ سخت اور زیادہ ناقابل اعتبار ہوگا، اسی لیے خود چور کی خاطر مجموعی طور پر دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ بڑے لوگ چوری کی وارداتوں کا محاسبہ کریں اور ان کے متعلق ایسا طریق کار اختیار کریں کہ دوسرے لڑکے اپنی ذاتی ذمہ داری پر انتقام لینے سے رک جائیں۔ دوسرے کی املاک کا مناسب احترام ضمنی عکس پیدا کیے بغیر بہ مشکل ممکن ہے۔ پکڑے جانے کا امکان لالچ کے زیر اثر

حقیقت ہے ہمیشہ کم دکھائی دیتا ہے اور وہ شخص جس کے لیے چوری امکان وقوعی کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے لیے مشکل سے ممکن ہوگا کہ اس اکساہٹ کا اس قدر کثرت سے شکار نہ ہو کہ آخر کار پکڑا نہ جائے۔

میرے خیال میں ایک اور معاملہ جس میں آزادی کے اکثر داعی راہ راست سے بھٹک گئے ہیں، یہ ہے کہ وہ بچوں کی زندگی میں مقررہ معمول کی اہمیت کو کافی طور پر محسوس کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ روز مرہ کے مشاغل بالکل بے لوچ اور تغیر نا پزیر ہوں، بلکہ کچھ مواقع ایسے بھی ہونے چاہئیں جب ان مشاغل میں تبدیلی کی جائے، مثلاً بڑے دنوں اور چھٹیوں کے موقع پر، لیکن یہ تبدیلیاں بھی مجموعی طور پر ایسی ہوں جن کی بچے کو پہلے سے توقع ہو۔ غیر یقینی زندگی ہمیشہ اعصاب کو تھکا دینے والی ہوتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ بچپن میں جو کچھ ہر روز پیش ہونے والا ہو اس سے کم و بیش واقف ہونا بچے میں عافیت و اطمینان کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ وہ اپنی دنیا کو محفوظ اور آئین کے تابع دیکھنا چاہتا ہے۔ جمیں قدرت کی ہم آہنگی پر جو اعتقاد ہے وہ زیادہ تر آفاقی پیمانے پر بچے کی اس خواہش کا اظہار ہے جس کی وجہ سے وہ مدرسے میں مقررہ معمول کا طالب ہوتا ہے۔ مہم جوئی اور جرأت نہایت قابل قدر اوصاف ہیں لیکن وہ بنیادی سلامتی کے پس منظر ہی میں پنپتے

آسانی سے نشو و نما پا سکتے ہیں۔

ایک اور بات جو مقررہ معمول کے ایک بڑے حصے کے حق میں ہے، یہ ہے کہ اگر بچوں کو وقت بے وقت اپنا کام دھندا خود انتخاب کرنا پڑے تو یہ چیز ان کے لیے وبال جان اور اکتا دینے والی بن جاتی ہے۔ وہ اس اس کو ترجیح دیتے ہیں کہ اکثر مواقع پر ابتدا ان کی طرف سے نہ ہو اور یہ کہ ان کا اپنا انتخاب اس خاکے کے اندر محدود ہو جو ان کے بہی خواہ بالغوں نے تیار کیا ہے۔ بچے بھی بڑوں کی طرح کامیابی کے اس احساس سے خوش ہوتے ہیں جو کسی مشکل پر قابو پالینے سے حاصل ہوتا ہے، لیکن اس کے لیے ایسی متواتر کوشش کی ضرورت ہے جو بیرونی ہمت افزائی کے بغیر بہت کم بچوں میں پائی جاتی ہے۔ مسلسل خود رہنمائی کی اہلیت انسان کی بیش بہا خوبیوں میں سے ہے۔ چھوٹے بچے اس اہلیت سے عملی طور پر نابلد ہوتے ہیں۔ یہ خوبی نہ تو بے لوچ ضبط سے اور نہ مکمل آزادی سے نشو و نما پا سکتی ہے۔ ایسا کڑا ضبط جو سپاہیوں پر جنگ کے زمانے میں مسلط ہوتا ہے، انسان کو بغیر بیرونی حکم کی مہمیز کے کام کرنے کے نا اہل بنا دیتا ہے۔ دوسری طرف بچپن کی مکمل آزادی سے بھی انسان ہنگامی خواہش کی مزاحمت کرنا نہیں سیکھ سکتا۔ اسی طرح اس میں ایک چیز پر توجہ مرتکز رکھنے کی صلاحیت، جب وہ ایک دوسری چیز میں بھی دل چسپی لے رہا ہو، نہیں پیدا ہو سکتی۔ نہ وہ لذات کی اس بلند

پر مزاحمت کر سکتا ہے ۔کہ وہ اپنے تھکا دیں گی اور بعد کے کاموں میں دخل انداز ہوں گی ، اس لیے قوت ارادی کی مضبوطی آزادی اور ضبط کی ایک لطیف آمیزش کی طالب ہے ۔ دونوں چیزوں میں سے ایک بھی زیادہ ہوگی تو یہ مضبوطی تباہ ہو جائے گی ۔

ضبط کی موزوں مقدار کی حدیں مقرر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر ہنگامی ترنگ کو چھوڑ کر بچے کا دلی تعاون ہر طرح کی تربیت کے ساتھ ہونا چاہیے ۔ ہر بچہ جسے چاروں طرف سے بھی خواہ بالغوں نے گھیر رکھا ہو ، دل کی گہرائی میں یہ سمجھتا ہے کہ وہ خود قدرے احمق ہے اور ان لوگوں کی رہنمائی کا شکر گزار ہوتا ہے جن کے متعلق اسے یقین ہو کہ وہ اپنے آرام و اقتدار کے لیے نہیں ، بلکہ خود اس کی بھلائی کے لیے سب کچھ کر رہے ہیں ۔ کھلاڑی ضبط کی پابندیوں کے سامنے قدرتی طور پر جھک جاتے ہیں ۔ اسی طور پر وہ بچے جنھیں ذہنی کارنامے سر انجام دینے کی اتنی ہی زبردست خواہش ہوتی ہے جتنی کہ کھیل کے میدان میں کھلاڑی کو اپنی کامیابی کی ، وہ بھی ضروری ضبط کے سامنے اسی طرح اپنی گردن خم کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے ، لیکن جس فضا میں ضبط کی ہر شق کو برا سمجھا جاتا ہو ، وہاں بچوں کے دلوں میں کبھی یہ خیال نہیں آئے گا کہ ہر قسم کی کامیابی حاصل کرنے کے لیے رضا کارانہ طور پر ایسے ضبط کے سامنے جھک جانا ضروری ہے ۔ عسیرالحصول کامیابی بطور نصب العین

نو عمروں کے دماغ میں موجود رہنا چاہیے تاکہ وہ بیہودہ اور بے مقصد نہ بن جائیں، لیکن ایسے لوگ کم ہیں جنھیں مکمل طور پر آزاد فضا میں یہ خیال پیدا ہوگا۔

اگر بچے بشرطیکہ ان کی تعداد بہت زیادہ نہ ہو، صحیح قسم کے بالغ کی تحویل میں ہوں تو ترغیب کے مقابلے میں تحکم کو گھٹا کر قریباً قریباً ناپید کیا جا سکتا ہے؛ مثال کے طور پر شفقت ہی کو لیجیے؛ میں باور ہی نہیں کر سکتا کہ پند و نصائح یا سزا سے کسی کے مزاج کو شفیق بنایا جا سکتا ہے، گو ان کی مدد سے کھلم کھلا ظلم کو روکا جا سکتا ہے۔ مشفق مزاجی کے لیے ایک طرف تو جبلی بشاشت چاہیے اور دوسری طرف بالغوں کے پیش کردہ مشفقانہ سلوک کا نمونہ، ورنہ بطور ایک اخلاق اصول کے شفقت کی تعلیم دینا میرے خیال میں بے فائدہ ہے۔

یہ امر نہایت اہم ہے کہ جو تھوڑا بہت ضبط ہو بھی اس سے جذبات پر کم از کم دباؤ پڑے کیونکہ جو بچہ یہ محسوس کرنے لگ جائے کہ اسے کسی اہم معاملے میں ٹوکا جا رہا ہے، ممکن ہے اس میں کئی ایک ایسی غیر موزوں خصوصیات پیدا ہو جائیں جن کی نوعیت کا انحصار اس کے کردار کی مضبوطی پر ہوگا۔ اگر وہ مضبوط ہے تو غضبناک باغی بن جائے گا، لیکن اگر کمزور ہے تو رونے دھونے والا منافق۔ اسی لیے گو ضبط پورے طور پر

ختم نہیں ہو سکتا تاہم اسے اس حد تک گھٹا دینا چاھیے جس حد تک کہ شائستہ اور قابل انسانوں کی تربیت تقاضا کرے ۔

تدریس کا معاملہ اس سارے سوال کا لب لباب ھے ۔ مجھے کچھ حیرت ھی ھے کہ تجربے نے مجھے اس یقین کی طرف مائل کیا ھے کہ سبق میں حاضری کو ضروری ٹھہرائے بغیر بھی کاف تعلیم دی جا سکتی ھے اور نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ پیدا کیے جا سکتے ھیں ۔ اس مقصد کے لیے ایسے حالات کا یک جا ھونا ضروری ھے جو موجودہ حالات میں وسیع پیمانے پر ممکن نہیں ، اس کے لیے بالغوں میں علمی مشاغل کی ایک حقیقی اور فطری تڑپ ھونی چاھیے ، جماعتیں چھوٹی ھونی چاھئیں اور استاد میں ھمدردی ، موقع شناسی اور سلیقہ ھونا چاھیے نیز ایسی فضا ھونی چاھیے جس میں بچے کو جماعت سے نکالا جا سکے اور کہا جا سکے کہ اگر تم جماعت میں صرف گڑ بڑ کے لیے آئے ھو تو جاؤ کھیلو ۔ عام مدرسوں میں ان حالات کے پیدا ھونے کے لیے بڑا وقت درکار ھے اس لیے موجودہ حالات میں اکثر لڑکوں کے لیے جماعت میں حاضری غالباً لازمی رھے گی ۔

بعض لوگ یہ دلیل پیش کرتے ھیں کہ اگر بچے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اس خیال سے کہ وہ اپنے ھم جماعت سے کم درجہ نہ بن جائے ، وہ خود ھی لکھنا پڑھنا اور دوسری چیزیں سیکھ لے گا ۔ اسی لیے جبر و اکراہ کے نہ ھونے سے تحصیل علم

میں زیادہ سے زیادہ ایک دو سال کی دیر ہو جائے گی ، لیکن میرے خیال میں یہ صورت غیر شعوری طور پر منحصر بالخیر ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں ہر دوسرا بچہ لکھتا پڑھتا ہو ، یہ اغلب ہے کہ ایک خاص بچہ اس احساس کمتری سے ہر وقت بچنے کی کوشش کرے گا جو ان پڑھ رہ جانے کی وجہ سے اس میں پیدا ہو جائے گا، لیکن ایک ایسی دنیا میں جہاں تمام بچے جبر و اکراہ سے مستثنیٰ ہوں ، وہاں جلدی ایسے احساس کمتری کے پیدا ہونے کا موقع ہی نہیں رہ جائے گا اور ہر آنے والی نسل اپنے پیشہ وروں کے مقابلے میں جاہل تر ہوتی چلی جائے گی ۔ مثلاً فطری طور پر بہت کم بچوں میں پہاڑے یاد کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ جب ان کے ساتھیوں کو پہاڑے یاد کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہو تو ممکن ہے وہ بھی محض شرم کے مارے محسوس کرنے لگیں کہ انہیں بھی پہاڑے یاد کرنے چاہئیں لیکن ایک ایسی قوم میں جہاں کسی کو بھی پہاڑے یاد کرنے پر مجبور نہ کیا جاتا ہو ، وہاں جلدی ہی چند بہت بڑھے ہوئے بچوں کے سوا کسی کو خبر نہ ہوگی کہ نو کو چھ سے ضرب دینے سے حاصل ضرب کیا ہوگا۔

اکثر بچوں کو ٹھوس علوم کا سیکھنا خوش گوار معلوم ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی فارم میں رہتے ہوں تو کسانوں کے مشاغل کا بغور مطالعہ کرتے رہیں گے اور ان کے بارے میں سب کچھ جان لیں گے ، لیکن

نظری علوم سے بہت کم لڑکوں کو لگاؤ ہوتا ہے حالانکہ نظری علوم ہی مہذب اجتماعی زندگی کو ممکن بناتے ہیں، اس لیے ایک مہذب اجتماعی زندگی کے تحفظ کا تقاضا یہ ہے کہ کچھ ایسے طریقے معلوم کیے جائیں جن کی مدد سے بچوں کو ایسے طریق پر عمل کرنا سکھایا جا سکے جو اُن کے لیے طبعی نہ ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ ہم جبر کی جگہ ترغیب سے کام لیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ اس معاملے کو بلا امداد غیرے ان کی طبیعت کے عمل پر چھوڑ دیا جائے۔ تعلیم کے بارے میں یہ خیال کہ وہ قدرتی نشو و نما کے مواقع بہم پہنچاتی ہے، میری رائے میں ایسا نہیں جس کی تائید وہ شخص کر سکے جو جدید معاشروں کی پیچیدگیوں کو جانتا ہے۔ بلا شبہ یہ کہنا ممکن ہے کہ یہ پیچیدگیاں قابلِ افسوس ہیں اور یہ بہتر ہوگا کہ ہم سادہ تر زندگی کی طرف لوٹ جائیں، لیکن افسوس ہے کہ لوٹنے کا یہ عمل انسانی آبادی کے ایک معتدبہ حصے کو بھوکوں مار ڈالے گا۔ متبادل صورت اتنی خطرناک ہے کہ گویا ہم موجودہ صنعتی دنیا کے پیچ در پیچ آلات و ادوات کی ضمانت دیے بیٹھے ہیں اور اس ضمانت کے باعث ہم مجبور ہیں کہ بچوں کو اس عہد کے نباہ میں حصہ لینے کے لیے تیار کریں۔ پس اگرچہ تعلیم کے سلبی نظریے میں صداقت کے بہت اہم عناصر پائے جاتے ہیں اور جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، یہ بڑی حد تک صحیح بھی ہیں، لیکن ذہنی اور فنی تربیت کے بارے میں

ہم آسے مکمل طور پر تسلیم نہیں کر سکتے اور جب یہ چیزیں پیش نظر ہوں تو ایسے نظریے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو کسی قدر زیادہ ایجابی ہو ۔

باب سوم

تعلیم اور نظریۂ وراثت

ایک بالغ پودے یا جانور کا کردار اس تعامل کا نتیجہ ہوتا ہے جو ماحول اور جاندار کے درمیان تخم ریزی کے وقت سے جاری رہتا ہے۔ میں نے اس بیان کو بے رنگ اور غیر متنازع فیہ بنانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے کیونکہ اس سے زیادہ قطعی بات کہنا اختلافی مسئلہ بن جائے گا۔ ایک جوان انسان کے کردار کی تشکیل میں ماحول اور وراثت کے تناسب کے متعلق مختلف علماء نے مختلف اندازے لگائے ہیں۔ سائنس دانوں میں سے علمائے نسلیات کا رجحان یہ ہے کہ وہ وارثت پر زیادہ زور دیتے ہیں اور علمائے نفسیات ماحول کو زیادہ اہم خیال کرتے ہیں۔ بہر حال اس موضوع پر باہمی اختلاف کی ایک اور راہ بھی ہے جو سائنسی نہیں بلکہ سیاسی ہے۔ قدامت پرست اور شہنشاہیت پرست وراثت پر زور دیتے ہیں کیوں کہ اگرچہ وہ قدرے نا تعلیم یافتہ ہیں لیکن سفید اقوام سے تعلق رکھتے ہیں۔ انتہا پسند تعلیم پر زور دیتے ہیں کیوں کہ یہ بالقوہ جمہوری ہے اور نیز اس کے طفیل انہیں امتیاز رنگ کو نظر انداز کرنے کی ایک دلیل ہاتھ لگ جاتی

ہے ۔ مجموعی طور پر یہ سیاسی اختلاف نسلی اور نفسیاتی اختلاف پر غالب ہے ۔ ہاگ ہن (Hoghen) اگرچہ ماہر نسلیات ہے مگر اصلاح نسل کے حق میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ، لیکن گاڈ ہرڈ (Godhard) اور ٹرمین (Terman) جو سرکاری ماہرین نفسیات ہیں ، وراثت پر زور دیتے ہیں ۔ امریکی ماہرین جو اس دبستان فکر کے حامی ہیں ، ہمیشہ سفید نسل کی بڑائی کے چیکے سے قائل رہے ہیں ، اگر چہ ان میں سے سخت ترین قدامت پرست بھی اس حقیقت کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ شمالی کیرولینا (Carolina) اور کن ٹکی (Kentucky) کے پہاڑی باشندوں کی ذہانت کا حاصل قسمت جو خالص انگریزی اور سکاچ نسل سے تعلق رکھتے ہیں ، یہودی تارکان وطن کے مقابلے میں کم ہے ۔

جہاں اختلاف کی گنجائش اتنی زیادہ ہو ، ہمیں پہلے سے حد بندی کے چند یقینی نقطے مقرر کر لینے چاہئیں ۔ تعلیم کے مستعد ترین حامی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ آدمیوں کے بچے آدمی ہی ہوتے ہیں اور جانوروں کے مقابلے میں انھیں زیادہ تعلیم دی جا سکتی ہے ۔ اسی طرح نہ وہ ایسی بدیہی حقیقتوں سے انکار کر سکتے ہیں کہ سفید اقوام کے بچے سفید اور سیاہ اقوام کے بچے سیاہ ہوتے ہیں ۔ اس کے بر عکس وراثت کے حامی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ایک ہونہار لڑکا دماغی کاہلی کی وجہ سے تباہ ہو سکتا ہے یا یہ کہ بچے کو افیون کھلانا جیسا کہ بعض ناواقف مائیں کرتی ہیں ، اس کی ذہانت

کے لیے نقصان دہ ہے لیکن ہم آہنگی کے یہ نقطے زیادہ دور تک ہمارا ساتھ نہیں دیتے۔

جب اس مسئلے پر سائنسی زاویۂ نگاہ سے غور کیا جاتا ہے تو دقت اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ والدین جو موروثی اوصاف کو بچوں میں منتقل کرتے ہیں، عموماً خود بھی ماحول کا ایک نہایت ہی اہم جزو ہوتے ہیں۔ والدین اور بچوں کے کردار میں مشابہت کی وجہ جیسے وراثت ہو سکتی ہے، ویسے ہی تقلید بھی۔ اس غرض کے لیے یتیم خانوں میں تربیت پانے والے بچے ہمارے لیے اچھا مواد ثابت ہو سکتے ہیں، لیکن بد قسمتی سے ان بچوں کے والدین کے متعلق ہماری معلومات اکثر حالتوں میں بہت ہی محدود ہوتی ہیں۔ ہم شکل جڑواں بچوں کا مطالعہ ان کی جبلی خصوصیات کی قوت کا اندازہ کرنے کے لیے کیا گیا ہے، لیکن بد قسمتی سے عام طور پر جڑواں بچوں کے ماحول میں زبردست مشابہت پائی جاتی ہے۔ توقع ہے کہ کوئی علم دوست کروڑ پتی ایک ایسے ادارے کی بنیاد رکھے گا جو ہم شکل جڑواں بچوں کو پیدا ہوتے ہی علیحدہ کر دے اور پھر بالکل مختلف ماحول میں ان کی تربیت کرے۔ میں تسلیم نہیں کر سکتا کہ اگر ایک ملکہ کے بطن سے دو جڑواں بچے پیدا ہوں جن میں سے ایک کی پرورش شاہی محلات میں اور دوسرے کی غلیظ گلی کوچوں میں کی جائے تو بیس برس کی عمر میں ان کی دماغی حالت ایک دوسرے کے مشابہ ہوگی لیکن تجربے کے نہ ہونے کی صورت میں مجھے تسلیم کرنا چاہیے کہ

نیرا قیاس بہ مشکل سائنسی ہے ۔ پہلے یہ اعتقاد تھا کہ اخلاق حاکمانہ کا ایک ایسا خاکہ موجود ہے جس کا انحصار شاہی خون پر ہے ۔ ہیرو ڈوٹس (Herodotus) بیان کرتا ہے کہ سائرس (Cyrus) کو جو پیدائش سے لےکر بارہ برس کی عمر تک بطور ایک کسان کے پلتا رہا ، اس کے دادا نے اس کی شاہانہ چال ڈھال سے پہچان لیا تھا : بہر حال مجھے شبہ ہے کہ نارڈک (Nordic) نسل کی بڑائی کا ایک انتہائی معتقد بھی اس کہانی کو قابلِ اعتماد کہہ سکے گا ۔

تعلیم کی قوت کے بارے میں بھی وراثت کی قوت ہی کی طرح مبالغے سے کام لیا گیا ہے ۔ جان ۔ بی ۔ واٹسن (John B. Watson) بظاہر اس بات کا معتقد ہے کہ ہر بچہ موزوں تعلیم سے مزارٹ (Mozart) یا نیوٹن بنایا جا سکتا ہے لیکن بد قسمتی سے ڈاکٹر موصوف نے ہمیں تاحال یہ نہیں بتایا کہ یہ تعلیم کیسے ہونی چاہیے ۔ تعلیم کی قدرتِ کاملہ کے بارے میں وہ کسی نظریے کا موجد نہیں ۔ مثال کے طور پر گاڈوِن (Godwin) ہی کو لیجیے جو "سیاسی انصاف" (Political Justice) کا مصنف اور شیلے کا خسر تھا ، اس موضوع پر اس کا بیان غیر مبہم ہے ۔

"اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ایک عقل مند آدمی کی کھوپڑی کی سمائی ایک بے وقوف کی سمائی سے زیادہ ہے تو یہ غیر اغلب نہ ہوگا ۔ یہ پھیلاؤ اس کی دماغی استعدادوں کے متواتر عمل سے پیدا ہوا ہے ، بالخصوص جب ہم

جانتے ھیں کہ بچے کی کھوپڑی کیسے لچک دار مادے سے بنی ھوتی ہے اور کس طرح بچپن ھی میں غیر معمولی استعداد کے لوگ اپنے مستقبل کی امتیازی خصوصیات کا کچھ حصہ حاصل کر لیتے ھیں۔'' افراد میں جو بنیادی اختلاف پائے جاتے ھیں وہ ان کے حاصل کردہ تاثرات اور ان پر گرفت رکھنے والے حالات سے پیدا ھوتے ھیں۔ یہ تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ ایک جیسی اخلاق تربیت تقریباً ایک جیسے آدمی نہیں بناتی ۔ فرض کیجیے کہ ایک انسان نے تمام وہ دلائل سنے اور وہ ان تمام مہیّجات کے زیر اثر آیا جن سے کبھی کسی مشہور ھستی کو دو چار ھونا پڑا ھو، اگر وھی دلائل اپنی تمام تر قوت اور اپنی تمام تر کمزوری کے ساتھ بلا اضافہ و تغیر ماہ بماہ اور سال بہ سال ایک ھی تناسب سے بیان کیے جائیں گے تو یقینی طور پر ایک ھی قسم کے خیالات پیدا کریں گے اور اگر وھی مہیّجات کسی بلا واسطہ یا اتفاق کمی کے بغیر کسی کو پیش آئیں گے تو ویسے ھی رجحانات کا موجب ھوں گے۔ اس ممتاز شخصیت نے جس علم یا جس پیشے کو انتخاب کیا تھا ، اس کے ساتھ اس فرضی انسان کو بھی جس کے بارے میں ھم یکساں تاثرات کی موجودگی فرض کر رھے ھیں، ضرور عشق ھوگا۔ فی الجملہ تاثرات ھی ھیں جو انسان کو بناتے ھیں اور تاثرات کی حکومت کے سامنے صرف حیوانی ڈھانچے کا فرق ناقابل بیان طور پر اھم اور بے اثر ہے۔ 'خیالات' کی جگہ 'ضمنی عکس' اور 'دلائل' کی جگہ 'مہیجات' کا لفظ رکھ دیجیے تو طرز تحریر سے قطع نظر آپ

یوں محسوس کریں گے گویا اس پیرے کا مصنف ڈاکٹر واٹسن ہے ۔

تعلیم کی قوتِ کاملہ کے اس نظریے کے خلاف بہت سے دلائل ہیں ۔ گاڈون کے اس نظریے کی حمایت دورِ حاضر کا کوئی انسان نہیں کر سکتا کہ سوچ بچار سے کھوپری بڑی ہو جاتی ہے ۔ بہر حال یہ چیز فیصلہ کن نہیں کیوں کہ ذہانت اور دماغ کے حجم کے درمیان سوائے انتہائی صورتوں کے کوئی واضح تعلق ثابت نہیں کیا جا سکتا ۔ فتورِ عقل اور کھوپری کی مادر زاد غلط ساخت میں اکثر تعلق پایا جاتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر واٹسن بھی ناقص تعلیم کو فتور عقل کی وجہ نہیں قرار دے گا ۔ ادنیٰ درجے کے ضعیف العقل لوگوں کا معاملہ اس سے صرف ایک درجہ کم واضح ہے ۔ دوسری انتہائی مثال حساب دان لڑکوں کی لیجیے ؛ ماحول میں کسی ایسی چیز کا تصور ناممکن ہے جو چند بھائیوں کی ایک جماعت میں ایک لڑکے کو اس قابل بنا دے کہ وہ بڑی بڑی رقموں کا جذرِ الکعب ریاضی کی کسی ایسی ظاہری تعلیم کے بغیر جو ہر اوسط لڑکے کو دی گئی ہے ، نکال سکے ۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ایک حساب دان اور فاتر العقل لڑکا فطری طور پر ایک اوسط لڑکے سے مختلف ہے تو یہ بالکل غیر اغلب معلوم ہوتا ہے کہ ان سے کمتر درجے کی ایسی مثالیں نہیں ہیں جو فطری طور پر مختلف ہوں ۔ اگرچہ غیر سائنسی تاثرات پر اعتماد کرنا خطرناک ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ان عملی ماہرین تعلیم کے تجربات کو ضرور کچھ نہ کچھ

اہمیت ملنی چاہیے جنہیں جہاں تک میری دریافت کا تعلق ہے، اس میں ذرا شبہ نہیں کہ ان کے شاگردوں کی جبلّی قابلیت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس امر کا اندازہ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے کہ اس میں کون سی چیز وراثت کا اثر ہے اور کون سی ماحول کا لیکن میری رائے میں یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ بالغوں کے ذہنی اختلافات کا کچھ حصہ جبلّی ہے۔

لیکن گاڈون اور ڈاکٹر واٹسن کے بیانات میں ایک دلیل ایسی ہے جس سے وہ اپنا نظریہ ثابت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ انسانوں میں عقل حیوانی نہیں پائی جاتی اور اسی بنا پر بچے کے دماغ میں تجربے کے بغیر کوئی امتیازی خصوصیت پیدا نہیں ہوتی۔ ہم اس کا الزامی جواب یوں دے سکتے ہیں۔ پولف (Povlov) اس بات کا مدعی ہے کہ اس کے کتّوں میں وہ چاروں مزاج جنہیں یونان کے مشہور حکیم بقراط (Hippocrates) نے گنایا ہے، پائے جاتے ہیں اور وہ اس قسم کی مختلف اعصابی بیماریوں کے شکار رہتے ہیں جو ان مزاجوں سے مخصوص ہیں، لیکن ڈاکٹر واٹسن جواب میں کہہ سکتا ہے کہ ممکن ہے مزاجی کیفیتوں کا اختلاف ایسے حالات کا نتیجہ ہو جن کا پولف کو علم نہیں اور یہ کہ تمام کتّے پیدائشی طور پر ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں؟ لہٰذا ہمیں اس کی نظریاتی دلیل کا ضرور جواب دینا پڑے گا۔

دلیل کی خاطر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جبلّی عکس

(جو عقل حیوانی کا قائم مقام ہے) سب نومولود بچوں میں ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ بچوں کے دماغوں میں فطری طور پر کوئی فرق نہیں ہو سکتا ؟ یقیناً نہیں! ضمنی عکس کی تعلیم ہی کو لیجیے، بعض بچے دوسروں کے مقابلے میں بہت جلد سیکھ جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض زیادہ مؤثر طریقے پر ان محرکات میں تمیز کرنا سیکھ لیں گے جن میں باہم خفیف فرق پایا جاتا ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ ہر طرح کی تعلیم نام ہے صرف ضمنی عکسوں کی تشکیل کا (حالانکہ یہ موضوع خود بحث طلب ہے) پھر بھی اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ سب بچے مساوی طور پر تربیت پذیر ہیں، اس لیے تعلیم کے انتہا پسند حامیوں کا موقف نظریۂ وراثت کے مقابلے میں نظریاتی حیثیت سے بھی اور علمی مشاہدات کے رو سے بھی بے بنیاد ہے۔

اگرچہ انسانوں میں باہمی فطری اختلاف کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن وہ علمی نتائج جو اصلاحِ نسلیات کے ماہرین نے اخذ کیے ہیں، زیادہ تر بالکل غیر سائنسی ہیں۔ کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ وہ کون سے ایسے موروثی عناصر ہیں جو انسان میں پسندیدہ سماجی اوصاف پیدا کرتے ہیں اور نہ یہ کہ کون سے عناصر بالترتیب غالب اور زوال پذیر ہیں۔ اس چیز کے لیے بھی کوئی دلیل نہیں کہ سماجی طور پر کون سی چیز پسندیدہ ہے۔ اپنے بہت ہی محدود تجربے کی بنا پر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصوری کی قابلیت اور حساب میں

ناقابلیت کے درمیان کچھ نہ کچھ ربط ضرور پایا جاتا ہے ۔ اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اصلاح نسل کے حامی اس کے متعلق کیا کریں گے؟ کیا وہ مصوروں کی ایسی نسل پیدا کرنی چاہیں گے جو حساب سے ناواقف ہو یا حساب دانوں کی ایسی نسل جو آرٹ سے بالکل بے بہرہ ہو ۔ ذہانت کے مسلمہ امتحانات اپنی حدود میں مفید ضرور ہیں لیکن وہ اخلاق یا فنی اوصاف کے جانچنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے ۔ اصلاح نسل کے کسی عملی اقدام کے لیے نہ تو اخلاق اور نہ سائنسی اساس کچھ ایسی قابل اعتماد ہے ، ہاں اس سے ضعیف العقلوں کو اولاد پیدا کرنے کے نا قابل بنایا جا سکتا ہے ۔ مندرجہ ذیل مفروضے غیر مستند ہیں :

(۱) حبشی فطری طور پر سفید اقوام سے کم رتبہ ہیں ۔

(۲) ایشیا میں پیدا ہونے والے لوگ یورپ اور امریکہ میں پیدا ہونے والوں کے مقابلے میں پست تر ہیں ۔

(۳) یورپ کے وہ باشندے جو ۴۵ درجہ عرض بلد کے شمال میں پیدا ہوئے ہیں ، اس عرض بلد کے جنوب میں پیدا ہونے والوں سے زیادہ بلند پایہ ہیں ۔

(۴) وہ اشخاص جن کے باپ کی آمدنی ہزار پونڈ سالانہ سے زیادہ ہے ، ان لوگوں کے مقابلے میں بہتر نسل سے ہیں جن کے باپ کی آمدنی ہزار پونڈ سے کم ہے ۔

اصلاح نسل کے اکثر ماہرین ان تمام نظریات کی درستی کے قائل ہیں ۔ ان میں سے پہلے تین ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قانون ترک وطن پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ اگر ہم قابلیت کے موروثی ہونے کے متعلق سائنسی زاویۂ نگاہ سے بحث کرنا چاہتے ہیں تو بہت سے تمہیدی کام کی ضرورت ہوگی ۔ سب سے پہلے ان قابل اندازہ خوبیوں کو دریافت کرنا پڑے گا جن کا تعلیم پر کچھ انحصار نہیں ، ذہنی آزمائشیں اسی مقصد کے لیے ہیں لیکن وہ زیادہ سے زیادہ ایک یکساں سماجی ماحول میں مفید ثابت ہو سکتی ہیں ۔ مثال کے طور پر بعض سوالات جن کا تعلق روپے پیسے سے ہے ، ان کے جوابات دیہاتیوں کے مقابلے میں شہری لڑکے زیادہ جلدی دے سکیں گے ؛ اسی طرح بعض اوقات ہم قافیہ الفاظ کے متعلق سوالات ہوں گے جن کے جوابات وہ لڑکے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے دے سکیں گے جنھیں نظم پڑھائی گئی ہو ۔ جب ذہنی آزمائشیں ان لڑکوں کے موازنے کے لیے جن کے پس منظر ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوں ، استعمال کی جائیں تو ان کے نتائج بہت ہی گمراہ کن ہوتے ہیں ؛ تاہم یہ انھی امتحانات کی بدولت ہے کہ وراثت کے حامی ماحول کے حامیوں کے خلاف مطلوبہ نتائج اخذ کرتے ہیں ۔

جب تک بچے والدین کے ساتھ رہیں ، اس وقت تک کسی ذہنی مماثلت کے بارے میں جو والدین اور بچوں میں پائی جاتی ہو ، وراثت اور تعلیمی عناصر کو علیحدہ کرنا ناممکن ہے ۔ اگر تمام آبادی کو ذہنی آزمائشوں میں شامل

کیا جائے تو کچھ عرصے کے بعد یتیم خانوں سے نہایت عمدہ مواد مل سکے گا۔ اگر کسی یتیم خانے کے بچوں اور ان کے والدین کی ذہانت میں ربط قائم کیا جا سکے تو یہ نظریۂ وراثت کا عمدہ ثبوت ہوگا لیکن تا حال ایسی شہادت تلاش کرنا باقی ہے۔

دماغی وراثت کا اصول تلاش کرتے وقت منتخب کردہ وصف سادہ، معین اور قابل اندازہ ہونا چاہیے؛ مثلاً یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی آدمی دانستہ ایک مہمل فقرہ بولے اور بچے سے کہے کہ وہ اسے دہرائے۔ ایک لمبے سے لمبے فقرے میں سے جس قدر الفاظ ایک بچہ درستی سے دہرانے میں کامیاب ہو جائے گا، اس سے ہم اس کی ایک ذہنی استعداد کا اندازہ لگا سکیں گے، گو یہ ضروری نہیں کہ یہ اس قدر پسندیدہ بھی ہو۔ ہر شخص کو معلوم ہے بنگالے میں یہ وصف نا قابل اعتبار حد تک پایا جاتا تھا لیکن ہمارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس کے والدین بھی اس وصف سے بہرہ مند تھے۔ اگر مدرسے کے تمام طالب علموں کا اس سلسلے میں ان کی ہر سال گرہ کے موقع پر امتحان لیا جاتا رہے تو ممکن ہے چالیس برس کے بعد وراثت کے بارے میں ہمارے پاس نہایت قیمتی مواد جمع ہو جائے۔

بہر حال اس طرز کے اعداد و شماری طریقوں سے مینڈل (Mendel) کا ایک پیرو کار مطمئن نہیں ہوگا کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ ایک خاص نسل کو یا نسلوں کے گروہ کو جن میں کوئی موروثی وصف مشترک طور

پر پایا جاتا ہے ، الگ تھلگ رکھا جائے لیکن ذہنی قویٰ اتنے پیچیدہ ہیں کہ بہت عرصے تک اس بات کے پورا ہونے کی کوئی توقع نہیں ۔ بہر حال یہ ممکن ہے کہ بعض ذہنی قویٰ مقابلتاً ایسے ہوں کہ انہیں دوسروں کی نسبت آسانی سے علیحدہ کیا جا سکے ۔ مثلاً حساب دانی اور موسیقی کی قابلیت اس طرز کی موزوں مثالیں معلوم ہوتی ہیں ، دونوں اعداد و شمار کے لحاظ سے بہت کم یاب ہیں لیکن جن لوگوں میں پائی جاتی ہیں ، اوسط سے غیر معمولی طور پر زیادہ پائی جاتی ہیں ؛ یہ دونوں اوصاف بعض خاندانوں میں لگا تار چلے آنے کا رجحان رکھتے ہیں لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ کہاں تک ان کا مدار تعلیم پر ہے ، مثلاً موزارت کا باپ گویا تھا لیکن اس کے باپ نے موسیقی کے ذوق اور موسیقی کے علم کو اپنے بیٹے میں منتقل کیا ۔ جہاں تک میں جانتا ہوں کبھی کوئی ماہر حساب دان یا موسیقی دان یتیم خانوں کی فضا سے نہیں اٹھ سکا اس لیے نظریۂ وراثت کی جانچ کا یہ طریقہ ہمیں کام نہیں دے سکتا ۔

گالٹن (Galton) اور اس کے حامیوں کی وہ کوششیں جو انہوں نے قابلیت کو موروثی ثابت کرنے میں کیں ، سائنسی طور پر یقیں آور نہیں ۔ اگرچہ یہ اغلب ہے کہ ان کے نظریے میں کچھ نہ کچھ صداقت موجود ہے لیکن جب تک آبائی ماحول کے اثرات کو علیحدہ کرنے کے طریقے دستیاب نہیں ہوتے ، یہ ساری حقیقت مشتبہ ہی رہے گی ۔

ایک عملی ماہر تعلیم کے زاویۂ نگاہ سے اس بحث کا

ماحصل واضح ہے ۔ یہ متوقع ہے کہ طلبہ کی قابلیتوں میں ایسا فرق ہوگا جسے ہم ماحول کا اثر نہیں کہہ سکیں گے ۔ بچوں میں جو فطری قابلیت بھی پائی جائے اسے نشو و نما دینی چاہیے اور اگر وہ حقیقتاً غیر معمولی ہو تو بچپن ہی سے اس کی نشو و نما پر وہ تمام وقت صرف کرنا چاہیے جو عام حالات میں عام تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے ، لیکن کسی بچے یا بچوں کے گروہ کے نسب ، معاشرتی معیار یا ان کے والدین کے کارناموں کے پیش نظر ان کی ذہانت کے حق میں یا اس کے خلاف پہلے سے کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے ۔ قابلیت کے موروثی ہونے کے متعلق ابھی تحقیقات کے لیے کافی گنجائش ہے اور ایسے وسائل دریافت ہو سکتے ہیں جن کی مدد سے اس مسئلے کا سائنسی زاویۂ نگاہ سے مطالعہ کیا جا سکے ، لیکن اگر ایسے وسائل اختیار کر بھی لیے جائیں تو انہیں بار آور ہونے کے لیے کم از کم ایک نسل تک ضرور انتظار کرنا پڑے گا ، اس اثنا میں سائنسی نقطۂ نگاہ سے معقول صورت یہی ہے کہ ہم جبلی اہلیتوں کی تقسیم اور اس کے وراثتی انتقال کے بارے میں اپنی لا علمی کا اقرار کریں ۔

باب چہارم

جذبات اور ضبط

ہر زمانے میں تعلیم کے دو مقصد رہے ہیں ، یعنی کچھ معلومات اور اخلاق حسنہ کی تربیت ۔ اچھے کردار کا تصور ملت کی اجتماعی روایات اور سیاسی اداروں کی نوعیت کے ساتھ بدلتا رہا ہے ۔ ازمنۂ متوسطہ میں جب غلام سے لے کر خدا تک سلسلہ وار مذہبی نظام رائج تھا تو فرماں برداری سب سے بڑی خوبی تھی ؛ بچوں کو والدین کی اطاعت اور بزرگان قوم کا احترام سکھایا جاتا ، انھیں بزرگان دین کی خدمت میں خود پر ہیبت طاری کر لینا اور تعلقہ دار کے حضور میں انکسار محسوس کرنا بھی سکھایا جاتا ؛ صرف شہنشاہ اور پاپائے اعظم ہی آزاد تھے ، اور چونکہ اس عہد کا نظام اخلاق آزادِ منش لوگوں کی رہنمائی سے قاصر تھا اس لیے وہ اپنا وقت باہم لڑنے جھگڑنے میں صرف کرتے تھے ؛ عہد حاضر کے لوگ تیرھویں صدی کے لوگوں سے مقاصد حیات اور طریق کار ہر دو میں اختلاف رکھتے ہیں ، جمہوریت نے تعاون کو تسلیم و رضا کا اور سماجی احساس کو احترام کا مقام دے دیا ہے ۔ وہ گروہ جس کے بارے میں سماجی احساس شدید طور پر کارفرما ہے ، قوم ہے جو اس سے پہلے کلیسا کی

ہمہ گیری کی وجہ سے بے اہمیت تھی ۔ اس اثنا میں پروپیگنڈے نے جبر کا پہلو چھوڑ کر ترغیبی پہلو اختیار کر لیا ہے ، اور اس نے ابتدائے عمر ہی سے موزوں جذبات کی روح پھونکنے کا اصول سمجھ لیا ہے ۔ کلیسا کے زمزمے ، سکولوں کے گیت اور قومی جھنڈے بچوں پر اثر انداز ہو کر انسان کے ان اعمال ما بعد کی تعیین کرتے ہیں جو انتہائی جوش کے عالم میں سرزد ہوتے ہیں ، ان اثرات کے خلاف عقل کا حملہ بے اثر ثابت ہوتا ہے ، ابتدائی تعلیم میں سیاسی عقائد کا اثر ہمیشہ نمایاں نظر نہیں آتا بلکہ عام طور پر معلم سے غیر ارادی طور پر سرزد ہوتا ہے اس لیے میں سردست سماجی نظام کی بحث کو حتے الامکان چھوڑ کر تربیت کردار کے متعلق غور کرنا چاہتا ہوں ، سماجی نظام کے بارے میں بعد میں اظہار خیال کروں گا ۔

جب کسی بچے یا حیوان میں ایک خاص کردار پیدا کرنا مطلوب ہو تو دو مختلف قسم کی تکنیک استعمال کی جاسکتی ہیں ؛ یا تو ہم بچے یا حیوان کو انعام کا لالچ دلا کر یا سزا سے ڈرا کر بعض افعال کرا سکتے ہیں ، یا ان کے کرنے سے روک سکتے ہیں اور یا دوسری طرف بچے یا حیوان میں ہم ایسے جذبات پیدا کر سکتے ہیں جو اس سے مجموعی طور پر مطلوبہ افعال سرزد کرائیں ۔

انعام اور سزا کی مناسب تقسیم سے آدمی کے ظاہری چلن کے کافی حصے کو قابو میں لانا ممکن ہے ۔ عام طور پر سزا اور انعام کی تنہا شکل یہ ہو سکتی ہے کہ تعریف کی جائے یا ملامت کی جائے ۔ اس طریقے سے ان بچوں میں

جو فطرتاً بزدل ہوتے ہیں ، جسمانی جرأت پیدا ہو جاتی ہے اور ایسے بچوں کو جنہیں تکلیف کا زیادہ احساس ہوتا ہے ، رواقیین کی سی برد باری سکھائی جا سکتی ہے ؟ اچھے اخلاق اگر بچپن میں نہ سکھائے گئے ہوں تو عنفوان شباب میں ان کے سیکھنے کے لیے ایک حقارت آمیز چین جبین سے زیادہ کسی اور سزا کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ جس چیز کو اچھا رکھ رکھاؤ کہتے ہیں ، اسے تقریباً تمام وہ لوگ اخذ کر لیتے ہیں جنہیں اس سے واسطہ پڑتا ہے کیونکہ اس کے خلاف عمل کرنے سے نکو بن جانے کا ڈر رہتا ہے ۔ جن لوگوں کو بچپن ہی سے یہ سکھا دیا جاتا ہے کہ جماعت کی ناراضگی کے خوف کو بد ترین بد قسمتی خیال کرنا چاہیے ، وہ ایک ایسی جنگ میں جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے ، میدان میں مر جانے کو اس بات پر ترجیح دیں گے کہ نادانوں کی نفرت کا شکار بنیں ۔ انگریزی پبلک سکولوں نے اس نظام کو انتہائی تکمیل تک پہنچا دیا ہے اور فراست کو انبوہ کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر کے اسے بڑی حد تک بے جان بنا دیا ہے ، یہ ہے وہ چیز جسے کہا جاتا ہے "لڑکے کو دلیر بنانا"۔

پس کرداریوں "کا تشکیلی" طریقہ بہ حیثیت ایک سماجی حربے کے بڑا کارگر اور بہت کامیاب ہے ۔ یہ انسان سے ایسے افعال سرزد کرا سکتا ہے اور فی الواقع کراتا ہے جو ان افعال سے بہت مختلف ہوتے ہیں جو بہ صورت دیگر سرزد ہوتے اور نیز اس سے ظاہری کردار میں ایک دل نشین ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے ؛ تاہم اس

کی حدود ضرور ہیں ۔

ہمیں سب سے پہلے فرائڈ کے ذریعے سے ان حدود کا سائنسی طریقے پر علم ہؤا ، اگرچہ نفسیاتی بصیرت رکھنے والے لوگوں کو بہت پہلے سے ارتقائی طور پر ان کا علم تھا ۔ ہمارے مقاصد کے لیے تحلیل نفسی کی سب سے ضروری دریافت یہ ہے کہ جس اندرونی تحریک کو کرداریوں کے طریقے سے کھلم کھلا عمل کی شکل اختیار کرنے سے روک دیا جاتا ہے ، وہ لازمی طور پر فنا نہیں ہو جاتی بلکہ سطح کے نیچے چلی جاتی ہے اور باہر نکلنے کے لیے کوئی ایسی راہ تلاش کر لیتی ہے جسے تربیت کے ذریعے بند نہیں کیا گیا ہوتا ۔ اکثر اوقات نیا نکاس اس بند کر دیے گئے نکاس کی بہ نسبت زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے ؛ بہر حال اس انحراف سے جذبات میں گڑ بڑ پیدا ہوتی ہے اور طاقت بے سود ضائع ہوتی ہے ، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ظاہری کردار کے بجائے جذبات کی طرف ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ توجہ کی جائے جو کردار کی تربیت کے لیے صرف تشکیلی طریقے کو کافی خیال کرتے ہیں ۔

علاوہ بریں بعض ایسی ناشائستہ عادات بھی ہیں جن کے بارے میں انعام اور سزا کا طریقہ خود اپنے زاویۂ نگاہ سے نا کام رہا ہے ، ان میں سے ایک بستر پر پیشاب کرنا ہے ؛ جب یہ عادت اس زمانے کے بعد بھی جب عام طور پر اسے رک جانا چاہیے ، جاری رہے تو سزا اسے صرف زیادہ شدید بنا دیتی ہے ۔ اگرچہ اس حقیقت کا ماہرین نفسیات کو بہت عرصے سے علم ہے لیکن بہت سے اساتذہ

کو اب بھی اس کا علم نہیں جو ایسے بچوں کو سالہا سال سے سزا دیتے چلے آرہے ہیں اور انہیں کبھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ سزا سے اصلاح نہیں ہو سکتی ۔ بڑی عمر کے لڑکوں میں اس عادت کی وجہ کوئی گہری غیر شعوری نفسیاتی گڑبڑ ہوتی ہے جسے علاج سے پہلے سطح پر لانا ضروری ہے ۔

یہی نفسیاتی نظام اس سے کم تر واضح مثالوں میں کار فرما ہے ۔ چنانچہ اب یقینی اعصابی امراض میں بھی یہ حقیقت بہت حد تک تسلیم کی جاتی ہے ۔ مثلاً جنون سرقہ کی بیماری بچوں میں عام پائی جاتی ہے اور معمولی چوری کی طرح اس کا علاج سزا سے نہیں بلکہ صرف نفسیاتی سبب کے معلوم کرنے اور رفع کرنے سے کیا جا سکتا ہے ۔ جس چیز کا بہت کم احساس کیا جاتا ہے ، وہ یہ ہے کہ ہم سب کم و بیش ایسے مختلف اعصابی امراض کا شکار ہوتے ہیں جن کی اساس جذباتی ہوتی ہے ۔ ایک آدمی کو ہم اسی وقت ذی ہوش کہیں گے جب وہ اپنے اوسط درجے کے معاصرین کی طرح معقول ہو لیکن ایک اوسط درجے کے انسان میں بہت سے فکری عمل جو آرا اور افعال کی تشکیل کرتے ہیں ، بالکل عجیب و غریب ہوتے ہیں — اس حد تک کہ حقیقی معقولیت کی دنیا میں انہیں غیر معقول کا نام دیا جائے گا ۔ اچھے سماجی کردار کا ایسے ذرائع سے پیدا کرنا جو سماج دشمن جذبات کو جوں کا توں چھوڑ دیں ، خطرناک ہے ۔ جب تک یہ جذبات باقی ہیں اور ان کے نکاس کی راہیں بند پڑی ہیں ، وہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتے

چلے جائیں گے اور ایسی ظالمانہ خواہشات کی طرف لے جائیں گے جن کی روک تھام بالآخر نا ممکن ہو جائے گی ۔ ایک کمزور ارادے کے آدمی میں یہ خواہشات جرائم کی صورت میں پھوٹ نکلیں گی یا بعض ایسے افعال کی شکل میں جن کے ساتھ سماجی سزائیں وابستہ ہیں ۔ مضبوط ارادے کے آدمی میں یہ اور زیادہ غیر موزوں صورت میں ظاہر ہوں گی ۔ ممکن ہے ایسا آدمی اپنے گھر میں جابر ، کاروبار میں سنگ دل ، سیاست میں جھگڑالو اور سماجی کردار میں بے رحم بن جائے ۔ ان اوصاف کی وجہ سے دوسرے لوگ جن کے کردار میں ایسے ہی نقائص پائے جاتے ہیں ، اسے پسند کریں گے اور جب وہ اپنی بساط اور قابلیت کے مطابق ایک شہر ، ایک قوم اور ایک زمانے میں نفرت اور بدنصیبی کا بیج بو چکے گا اور اس دنیا سے رخصت ہوگا تو تمام عالم اس کا احترام کرے گا ۔ انسانی مسرتوں میں اضافہ کرنے کے لیے ایک آدمی میں اچھے کردار اور برے جذبات کا ایک ساتھ ہونا کافی نہیں ۔ اگر موزوں سماجی اطوار کے بارے میں ہمارا معیار یہی ہے تو کردار کی تربیت کے لیے ضرور کسی اور چیز کی تلاش کرنی پڑے گی ۔

اس طرح کے سوچ بچار اور بچوں کی فطرت کے ہمدردانہ مطالعے سے یہ نتیجہ نکلتا معلوم ہوتا ہے کہ تربیت کردار کا جو طریقہ کرداریوں کا وضع کردہ ہے وہ ناکافی ہے اور ضرورت ہے کہ کسی بالکل مختلف طریقے کے ملانے سے اس کی تکمیل کی جائے ۔

بچوں کے تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر انہیں ایک

ایسی فضا میں رکھا جائے جہاں پسندیدہ احساسات عام ہوں اور ناپسندیدہ بہت کم ، وہاں صرف ان کے ظاہری کردار ھی پر نہیں بلکہ ان کے احساسات پر بھی اثر اندازی ممکن ہے۔ کچھ بچے اور کچھ بالغ بھی خوش باش طبیعت کے ہوتے ہیں اور کچھ افسردہ طبع ، کچھ ایسے ہوتے ہیں جو معمولی سی خوشی سے بھی جو ہاتھ لگ جائے ، بہ آسانی بہل جاتے ہیں لیکن بعض ایسے ہوتے ہیں جو اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک وہ خاص مسرت جس کے پیچھے وہ پڑے ہیں ، حاصل نہ ہو جائے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جب تک اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہو ، بیشتر انسانی آبادی پر دوستانہ اعتماد کا اظہار کرتے ہیں لیکن بعض ایسے ہوتے ہیں جو اکثر لوگوں کو شدید شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بچے کے جذبات کی عام حالت عموماً بالغ ھی کی مانند ہوتی ہے ، اگرچہ بعد کی زندگی میں لوگ اپنی کم زوریوں اور رنجشوں کو تھوڑی یا بہت حد تک چھپانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ پس یہ نہایت ضروری ہے کہ بچوں کے جذباتی رویے بیشتر ایسے ہوں جو انہیں بچپن ، یا بعد کی زندگی میں خوش و خرم ، کامیاب اور کار آمد بنائیں ، بجائے اس کے کہ وہ انہیں ناخوشی ، ناکامی اور خبث باطن کا راستہ دکھائیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسے ماحول کا تعین جو مفید جذبات کی نشو و نما کرے ، نفسیات کی طاقت میں ہے ، اور یہ کہ اکثر اوقات ہوش مندانہ شفقت بھی سائنس کی امداد کے بغیر صحیح نتائج پر پہنچ سکتی ہے۔ جب اس طریق کار پر درستی

سے عمل کیا جائے تو کردار پر اس کا اثر انعام اور سزا کے طریقے کے مقابلے میں زیادہ انقلاب آفرین اور زیادہ اطمینان بخش ہوتا ہے۔

بچے کے لیے مناسب جذباتی فضا کا سوال بہت ہی نازک ہے اور بلا شبہ بچے کی عمر کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ بچپن کے سارے زمانے میں ایک تدریجی تخفیف پذیر حد تک احساس امن کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اس مقصد کے لیے شفقت اور خوش آیند مقررہ معمول لا بدی ہیں۔ بڑوں کے ساتھ تعلقات، جذباتی لاڈ پیار کے بجائے کھیل کود اور جسمانی آسائش کی نوعیت کے ہونے چاہییں۔ دوسرے بچوں کے ساتھ گہری بے تکلفی ہونی چاہیے، سب سے بڑھ کر یہ کہ تعمیر، تحقیق و تفتیش اور ذہنی اور فنی ہدایت کاری کے معاملے میں پہل کرنے کے مواقع موجود ہونے چاہییں۔ بچے کی دو باہم متضاد ضرورتیں ہوتی ہیں، یعنی سلامتی اور آزادی؛ ان میں سے آخر الذکر اول الذکر کو آہستہ آہستہ گھٹا کر خود نشو و نما پاتی ہے۔ بچوں سے بڑوں کی شفقت ایسی ہونی چاہیے جو انھیں سلامتی کا احساس دلائے، نہ کہ آزادی کو محدود کر دے، یا بچے میں گھرائے جوابی جذبات پیدا کر دے۔ کھیل میں جو بچے کی اہم ترین ضرورت ہے، صرف دوسرے بچے ہی حصہ نہ لیں بلکہ والدین بھی شامل ہوں۔ بچے اور والدین میں بہترین تعلقات پیدا کرنے کے لیے یہ امر ازحد ضروری ہے۔

موجودہ حالات میں عنصر آزادی کا حصول بہت مشکل ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر پہلے باب میں ہو چکا

ہے ، میں غیر مشروط آزادی کا حامی نہیں ہوں لیکن آزادی کی خاص صورتوں کا جسے اکثر بالغ نا قابل برداشت تصور کرتے ہیں ، ضرور موید ہوں ۔ بچوں سے جبراً بزرگوں کا احترام نہ کرانا چاہیے بلکہ بچوں کو اجازت ہونی چاہیے کہ اگر چاہیں تو بڑوں کو احمق کے نام سے بھی پکاریں ۔ ہم اپنے بچوں کو اظہار خیال سے منع کر کے انہیں اس چیز سے نہیں روک سکتے کہ وہ ہمیں احمق سمجھیں ، کیونکہ اگر انہیں ایسا کہنے کی اجازت نہیں تو احتمال یہ ہے کہ وہ ہمیں برا سمجھنے لگیں گے ۔ بچوں کو قسمیں کھانے سے نہ روکنا چاہیے ، اس لیے نہیں کہ قسم کھانا کوئی پسندیدہ فعل ہے ، بلکہ اس لیے کہ انہیں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ جب وہ سچ بول رہے ہیں تو قسم کھانے یا نہ کھانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ انہیں مکمل طور پر جنسی ممنوعات سے آزاد ہونا چاہیے اور خواہ ان کی گفتگو ہچکچانے والے بالغوں کو ناشائستہ ہی کیوں نہ معلوم ہو ، انہیں ٹوکنا نہ چاہیے ۔ اگر وہ مذہب ، سیاست اور اخلاقیات پر اظہار رائے کریں تو انہیں دلائل سے بشرطیکہ وہ حقیقی دلائل ہوں ، جواب دینا چاہیے ، لیکن اگر صرف اعتقاد ہی اعتقاد ہو، پھر نہیں ۔ بالغ لوگ بچوں کو سوچ بچار کے طریقے تجویز کر سکتے ہیں اور انہیں کرنا بھی چاہیے لیکن اپنے فیصلے ان پر ٹھونسنے نہ چاہییں ۔

ایسی حالت میں کسی شائبۂ آزردگی کے بغیر جو روکنے ٹوکنے یا کثرت مطالبات سے محبت کے ماحول میں پیدا ہوتی ہے ، بچے بڑے ہو کر نڈر اور فطرتاً خوش باش

ہوں گے۔ ان کی فراست پابندیوں سے آزاد ہوگی اور انسانی مسائل میں ان کی رائے اس شفقت کی حامل ہوگی جو اس اطمینان سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ ایسی دنیا جہاں انسان اس قسم کے جذبات سے آراستہ ہوں گے، ہمارے اس معاشرتی نظام کا خاتمہ کر دے گی جس میں جنگیں ہیں، ظلم ہیں، معاشی بے انصافیاں ہیں، آزادیٔ تحریر اور آزادانہ تحقیق کا خوف ہے اور توہم پرستانہ اخلاق ضابطہ ہے۔ ان معاشرتی برائیوں کی برداشت کا انحصار خیالات کی پستی اور خبث باطن پر ہے جو فقدان آزادی نے پیدا کیے۔ ڈاکٹر واٹسن جو اخلاق کے جبلی پہلوؤں کی اہمیت کو کم از کم کر کے دکھاتا ہے، بہر حال اتنا تسلیم کرتا ہے کہ جب بچے کے کسی عضو کو کھینچا جائے تو اپنے فطری رد عمل کے طور پر غصہ آتا ہے، یہ جبلی جذبہ ہی خواہش آزادی کا احساس ہے۔ وہ شخص جس کی زبان بہ ذریعۂ قانون امتناع آزادیٔ تقریر سے روک دی جائے یا جس کے قلم پر سنسر بٹھا دیا گیا ہو یا جس کے جذبات محبت کو ایسے اخلاق سے جو جذبۂ رقابت کو محبت پر ترجیح دیتے ہیں، نشو و نما پانے سے روک دیا گیا ہو یا جس کے بچپن کو اخلاق کے ضابطے میں جکڑ دیا گیا ہو یا جس کی جوانی کو بے رحم تقلید پرستی کی زنجیروں میں کس دیا گیا ہو، اسے اس حائل و مزاحم دنیا کے خلاف اتنا ہی غصہ آئے گا جتنا کہ اس بچے کو جس کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر بے حس کر دیا گیا ہو۔ اس غصے سے وہ تخریب پر اتر آئے گا اور اپنی رفتار طبع اور مواقع کے مطابق

انقلاب پسند یا جنگجو یا ایذا رساں معلم اخلاق بن جائے گا ۔ ایسے انسان تیار کرنا جو ایک نئی بہتر دنیا کی تخلیق کر سکیں ، جذباتی نفسیات کے لیے ایک معما ہے ۔ یہ ایسے انسان پیدا کرنے کا سوال ہے جن کا فہم آزاد اور جن کی طبیعت خوش باش ہو ۔ اس مشکل کا حل سائنس کی طاقت سے باہر نہیں لیکن کمی ارادے کی ہے ، نہ کہ طاقت کی ۔

باب پنجم

گھر اور سکول کا موازنہ

یہ خیال کہ بچوں کو کلی طور سے گھر ہی پر تعلیم دی جائے ، ایک ایسا نظریہ ہے جو متروک ہو چکا ہے - اگرچہ لاک اور روسو کی کتابوں میں یہ مفہوم موجود ہے - سکندر اعظم ، ھنی بال اور جان اسٹوارٹ مل کی تربیت اسی نظریے کے ماتحت کی گئی تھی ؛ در حقیقت یہ صرف دولت مندوں کے لیے قابل عمل ہے اور صرف اسی لیے اس پر کسی مزید بحث کی ضرورت نہیں لیکن گھر اور سکول میں کیا تناسب ہونا چاہیے اور بچے کس عمر میں سکول جانا شروع کریں ، یہ دو جائز طور پر بحث طلب امور ہیں -

یورپ کے اکثر ممالک کا مزدوروں کے اکثر بچوں کے بارے میں یہ خیال ہے کہ وہ چھ برس کی عمر سے تیرہ چودہ برس تک دن کو پڑھانے والے مدرسوں میں جاتے رہتے ہیں - مزدوروں کے قابل لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک خاص فی صدی تعداد کو وظائف دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے تاکہ وہ اس عمر کے بعد بھی تعلیم جاری رکھ سکیں ، اگرچہ آسودہ حال لوگوں کے بچے قدرتی طور پر ایسا کرتے ہی ہیں - اس امر پر بھی ابھی

تک اتفاق نہیں ہو سکا کہ اُن اخراجات سے قطع نظر جو حکومت کو برداشت کرنا پڑیں گے ، عام تعلیم کے لیے عمر کی کون سی حد مقرر کرنا موزوں ہوگا ۔ نہ اس امر ہی پر اتفاق رائے ہو سکا ہے کہ ان کو پڑھانے والے مدرسوں اور رہائشی مدرسوں میں سے کس کو ترجیح دی جائے ۔ عام رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ شے جو اچھے گھر کے نام سے پکاری جاتی ہے ، ہر قسم کے رہائشی مدرسے سے بہتر ہے اور کچھ غیر معین فی صدی گھر ایسے ہیں جنھیں مطلوبہ معنوں میں اچھا گھر نہیں کہا جا سکتا ۔ میری رائے میں یہ سوال مشکل ہے اور دونوں طرف کے دلائل کافی مضبوط ہیں ۔ حقیقتاً اس سوال کے دو جزو ہیں ؛ اول سکول جانے کی عمر کیا ہونی چاہیے ؟ دوم آیا سکول غیر رہائشی ہوں یا رہائشی ؟ اب ہم ان کے متعلق بالترتیب گفتگو کرتے ہیں ۔

مدرسے جانے کا آغاز کس عمر سے ہو ؟ اس سوال کے جواب کا انحصار ''گھر'' پر ہوگا ، لیکن اس کی جغرافیائی کیفیت پر ، نہ کہ اس کی اخلاق اور نفسیاتی نوعیت پر ؛ مثلاً جو بچہ دیہات میں کسی کھیت سے ملحق مکان میں رہتا ہو وہ اپنا وقت نہایت خوشی سے مفید طور پر کھیتوں میں گھومنے ، جانوروں کا مشاہدہ کرنے ، بھوسا تیار کرنے ، فصلیں کاٹنے ، صاف کرنے اور ہل جوتنے کا مطالعہ کرنے میں گزار سکتا ہے ، تا آنکہ وہ وقت آ جائے جب کہ رسمی لکھائی پڑھائی شروع کرنا ضروری ہو ، لیکن اس شہری لڑکے کی حالت جس کے

والدین ایک تنگ و تاریک کمرے میں رہتے ہیں ؛ بالکل مختلف ہوتی ہے ۔ اس کے لیے مدرسہ اس لیے پسندیدہ ہے کہ اسے آزادی کی فضا میں پناہ مل سکے — چلنے پھرنے کی آزادی ، چیخنے چلانے کی آزادی اور ساتھیوں سے ملنے جلنے کی آزادی — مجھے بار ہا ایسے طبابت پیشہ اصحاب سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو ابتدائی تربیتی مدرسوں کے اس لیے مخالف تھے کہ ان کے خیال میں ہر مدرسہ ایک ایسی جگہ ہونا چاہیے جہاں مقررہ اسباق پڑھائے جاتے ہوں ۔ ایک صحیح تربیتی مدرسے میں صرف اتنی ہی تعلیم دی جانی چاہیے جو بچوں کو بہلانے کے لیے ضروری ہو ۔ پس بچوں پر زیادہ بوجھ ڈالنے کے بجائے انہیں اس نگرانی اور روک ٹوک سے چھٹکارا دلانا چاہیے جس سے چھوٹے چھوٹے گھروں میں بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ۔

جن شہری بچوں کے والدین غریب ہوتے ہیں ان کی کچھ جسمانی اور نفسیاتی ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں گھر میں پورا نہیں کیا جا سکتا ؛ ان میں پہلی ضرورت روشنی اور ہوا ہے ۔ مارگریٹ میکملن (Margaret Mcmillan) نے محسوس کیا کہ اس کے تربیتی مدرسے میں تعلیم پانے والے بہت سے بچے جب پہلے پہل مدرسے میں آئے تو سوکھے کی بیماری کا شکار تھے ، لیکن تقریباً سب کے سب کھلی ہوا میں رہنے سے شفا یاب ہو گئے ۔ دوسری ضرورت موزوں خوراک ہے ؛ اس پر کچھ بہت خرچ نہیں اٹھتا اور نظری طور پر یہ گھر ہی میں مہیا

کی جا سکتی ہے، لیکن عملی طور پر نا واقفیت اور کھانے پکانے کے بارے میں ہماری قدامت پسندی کی وجہ سے یہ چیز غیر ممکن العمل بعمل ہے۔ تیسری ضرورت کھیل کود کے لیے جگہ کا ہونا ہے؛ بہت غریب طبقے کے بچے گلی کوچوں میں اس ضرورت کو پورا کر لیتے ہیں، لیکن باقی بچے اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بہر حال گلیاں اس مقصد کے لیے موزوں مقام نہیں ہیں۔ چوتھی ضرورت شور کی ہے؛ بچے کو شور مچانے سے روکنا بے رحمی ہے؛ لیکن اکثر گھروں میں بہت سے بچوں کا مل کر شور مچانا بڑی عمر کے آدمیوں کی زندگی کو دوبھر بنا سکتا ہے۔ پانچویں ضرورت قریباً قریباً ہم عمر بچوں کی رفاقت ہے؛ یہ ضرورت عمر کے دوسرے سال کے اختتام پر شروع ہوتی ہے اور نہایت تیزی سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ چھٹی ضرورت والدین کی دلچسپی سے چھٹکارا پانا ہے؛ غریب والدین کے مقابلے میں آسودہ حال والدین کی صورت میں یہ عنصر بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ غریب مائیں تو فرصت نہ ملنے کی وجہ سے بچوں کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتیں جتنا متوسط طبقے کی مائیں متواتر نگرانی سے پہنچاتی ہیں؛ خواہ نگرانی کتنی ہی سوجھ بوجھ اور کریم النفسی سے کیوں نہ کی جائے۔ ساتویں ضرورت ایک ایسا ماحول ہے جس میں بچے کے دل بہلاوے کے موزوں سامان موجود ہوں لیکن مصنوعی طور پر اسے محفوظ بنا دیا گیا ہو۔ اس میں پتھر کی سیڑھیاں، چبھنے والے کونے اور نازک

اور قیمتی اشیاء موجود نہ ہوں ۔ وہ بچے جو چھ برس کی عمر تک ان ضروری چیزوں سے محروم رہیں گے ، وہ عموماً بیمار ، پست ہمت اور عصبی مزاج ہوں گے ۔

بڑے شہروں میں بچوں کی دیکھ بھال کا مسئلہ ایسا ہے جس کی طرف سے بہ استثناء بلدیۂ ویانا (Vienna) عہد حاضر کی تمام حکومتیں سردست غافل ہیں ۔ اس سوال کا تعلق بہت حد تک فن تعمیر سے ہے ۔ شہروں کے زیادہ غریب محلوں میں رہائشی کمرے ایک کھلے صحن کے تین طرف بنا کر چوتھی طرف کو دھوپ کے لیے کھلا چھوڑ دینا چاہیے ، درمیانی جگہ بچوں کے لیے وقف ہونی چاہیے جہاں وہ کھیلیں ، نگرانی میں کھانا کھائیں اور صرف سونے کے لیے والدین کے پاس آئیں ۔ اس سے بہ یک وقت ماؤں کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا اور بچے بھی بہت زیادہ مستفید ہوں گے ، لیکن سر دست علیحدہ علیحدہ گھروں کی انفرادیت ہماری راہ میں رکاوٹ ہے ، بالخصوص انگلستان میں جہاں باقی تمام ملکوں کے مقابلے ہر عمارتی پہلو زیادہ غالب ہے ۔

میرے خیال میں ضرور فرض کر لینا چاہیے کہ امیر لوگ اپنے بچوں کو اجتماعی کھیل کود کے میدانوں کی خوشیوں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیں گے ، لیکن دن کے ایک بہت بڑے حصے کا آزاد فضا کی پناہ میں بسر کرنا امیروں کے بچوں کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا غریبوں کے بچوں کے لیے ۔ ایک شہری گھر خواہ کتنا ہی اچھا بنا ہوا کیوں نہ ہو ، بچوں کی

صحت مندانہ ذہنی اور جسمانی نشو و نما کا پورے طور پر کفیل نہیں ہو سکتا ۔ بھاری فیسوں سے معاشری امتیاز قائم رکھا جا سکتا ہے ، لیکن ہر طبقے کے لیے کسی نہ کسی تربیتی سکول کا ہونا ضروری ہے ۔

اس وقت تک ہم بچے کی ما قبل مدرسہ عمر پر غور کرتے چلے آئے ہیں ؛ جوں جوں بچے بڑے ہوتے جاتے ہیں ، رہائشی مدرسوں کے حق میں دلائل زیادہ زور دار ہوتے جاتے ہیں ۔ تمام دلائل سے زیادہ مضبوط دلیل یہ ہے کہ رہائشی مدرسے دیہات کے بہترین ماحول میں کھولے جا سکتے ہیں حالانکہ لڑکوں کے بیشتر غیر رہائشی مدرسوں کا شہروں میں ہونا ضروری ہے ۔ ایک اور دلیل جو سب صورتوں میں نہ سہی اکثر صورتوں میں ضرور صادق آتی ہے ، یہ ہے کہ گھر غالباً ایسی جگہ ہوگی جہاں بچوں کے اعصاب پر دباؤ پڑنے کا احتمال ہے ۔ ممکن ہے والدین جھگڑتے رہتے ہوں ، ماں ضرورت سے زیادہ فکر مند ہو ، باپ نا مہربان ہو ، کوئی اور بھائی بہن منظور نظر ہو ، جس سے دوسرے حسد کرتے ہوں ، یا والدین میں سے کوئی ایک غیر منصفانہ طور پر شفیق ہو ، ایک نہ ایک پہلو سے گھر بہت ہی جذباتی جگہ ہے ۔ بچے ایک خاموش زندگی چاہتے ہیں جس میں مسرت اور سر گرمی ہو ، جذبات کی شدت نہ ہو ۔ اس کے برعکس میرے خیال میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ والدین کی عقل مندانہ محبت کی ایک موزوں مقدار بچے کے لیے مفید ہے جس سے اسے

اپنی سلامتی اور اپنی انسانی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔ ان دو متضاد پہلوؤں کے درمیان توازن قائم رکھنا آسان کام نہیں۔

نظری طور پر گھر اور سکول کا موازنہ مشکل کام ہے۔ اگر معیاری گھروں کا موجودہ مدرسوں سے مقابلہ کیا جائے تو ترازو کا پلڑا ایک طرف جھک جائے گا، لیکن اگر معیاری مدرسوں کا موجودہ گھروں سے مقابلہ کیا جائے تو پلڑا دوسری طرف کو جھکے گا۔ مجھے اس میں ذرا شبہ نہیں کہ معیاری مدرسہ معیاری گھر سے بہتر ہے، کم از کم ایک معیاری شہری گھر سے، کیوں کہ یہاں زیادہ روشنی اور ہوا کا بند و بست ہوگا، چلنے پھرنے کی زیادہ آزادی ہوگی اور ہم عمر لڑکوں کی رفاقت میسر آسکے گی، لیکن یہ کسی حالت میں نہ سمجھنا چاہیے کہ موجودہ مدرسہ موجودہ گھر سے بہتر ہے۔ اکثر والدین بچوں کو پیار کرتے ہیں اور یہ پیار ہی اس نقصان کو محدود کر دیتا ہے جو وہ انہیں پہنچاتے ہیں، لیکن افسرانِ تعلیم کو متعلقہ بچوں سے پیار نہیں ہوتا؛ زیادہ سے زیادہ انہیں قومی جذبہ اس کام پر ابھارتا ہے جس کا رخ ساری قوم کی طرف ہوتا ہے، نہ کہ صرف اُن بچوں کی طرف، یا کم از کم انہیں ایسے سیاست دان سمجھنا چاہیے جو ایک بہتر چیز کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔ موجودہ حالات میں بچے کی ذہنیت کی تشکیل میں گھر اہم حصہ لے رہا ہے۔ گو ہم اس کی کارکردگی کو پورے طور پر اچھا

تو نہیں کہ سکتے لیکن غالباً یہ اس سے بہتر ہے جو بچوں کے مکمل طور پر حکومت کے بس میں ہونے کی صورت میں رونما ہوتی ہے ۔ بچے کو گھر کی فضا میں شفقت کا تجربہ ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ایک ایسی چھوٹی سی برادری کا جس میں اسے اہمیت حاصل ہوتی ہے؛ نیز اسے ہر دو صنفوں کے مختلف عمر کے افراد سے واسطہ پڑتا ہے اور نیز بالغ آدمیوں کی گونا گوں مصروفیتوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے ۔ اس لحاظ سے گھر مدرسے کی مصنوعی سادگی کے برے اثرات کی اصلاح کرنے والا ثابت ہوتا ہے ۔

گھر کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ افراد کے تباین کو محفوظ رکھتا ہے ۔ اگر ہم سب ایک ہی طرح کے ہوتے تو ممکن ہے کہ دفتریت پرست حاکم یا ماہر اعداد و شمار کو آسانی ہو جاتی ، لیکن یہ صورت بہت غیر دل چسپ ہوتی اور اس کا نتیجہ ایک حد درجہ غیر ترقی پسند معاشرے کی صورت میں نکلتا ۔ موجودہ حالات میں افراد کا اختلاف ان کے گھروں کے تباین کی وجہ سے زیادہ شدید صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ حد سے زیادہ اختلاف بھی سماجی استحکام کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے ، لیکن تھوڑا سا اختلاف بہترین تعاون کے لیے ضروری ہے ۔ ایک آرکسٹرا کے لیے مختلف قابلیتوں اور خاص حد تک مختلف مذاق کے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے ، لیکن اگر سب لوگ ترم بجانے ہی پر اصرار کریں تو آرکسٹرا کی موسیقی ناممکن ہو جائے گی ۔ اسی طرح

سماجی تعاون بھی مذاق اور قابلیتوں کا اختلاف چاہتا ہے ، اس لیے اگر والدین کے اثرات کو آزاد رکھنے کے بجائے تمام بچوں کو ایک ہی طرح کے اثرات کے ماتحت رکھا جائے تو اس چیز کا بہت کم امکان رہ جائے گا ۔ میرے خیال میں افلاطون کے اس نظریے کے خلاف کہ بچوں کی تربیت تمام تر حکومت کو سنبھال لینی چاہیے ، یہ دلیل بہت اہم ہے ۔

موجودہ دنیا میں خاندان کے علاوہ دو عوامل اور ہیں جو بچوں سے سروکار رکھتے ہیں ، ان میں سے ایک حکومت اور دوسرا کلیسا ہے ۔ انگلستان میں مزدوروں کے دو تہائی بچوں کو تو حکومت تعلیم دلاتی ہے ، باقی ایک تہائی مختلف مذہبی اداروں میں بٹ جاتی ہے ، زیادہ تر کلیسائے انگلستان اور رومن کیتھولک جماعت میں ۔ آسودہ حال لوگوں کے بچوں کو زیادہ تر کلیسائے انگلستان کے ماحول میں تعلیم دی جاتی ہے ۔ اکثر بہترین زنانہ سکول اینگلو کیتھولک ہیں اور معاشرے کے اونچے اور درمیانی طبقے پر مذہب کی گرفت بڑھتی جا رہی ہے ۔ کلیسا اور حکومت دونوں اپنی موجودہ صورت میں تعلیمی عاملوں کے طور پر بعض نقائص رکھتے ہیں ۔ میں ان نقائص کے متعلق تفصیل سے بعد کے ابواب میں بحث کروں گا اور اس وقت پیش گفتاری کے طور پر صرف اتنا کہوں گا کہ حکومت اور کلیسا دونوں بعض ایسے مسائل کے ماننے کا مطالبہ کرتے ہیں جنھیں کوئی غیر متعصب آدمی نہیں مان سکتا اور نیز

ایسے ظالمانہ ضابطۂ اخلاق کا مطالبہ کرتے ہیں جسے صرف ایسے لوگ ہی تسلیم کر سکتے ہیں جن کے جذبات شفقت کو کٹر عقائد کے ذریعے ابھرنے سے روک دیا گیا ہو ۔ ان ناقابل تسلیم مسائل میں سے مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں :

رومن کیتھولک جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ ایک پادری روٹی کے ایک ٹکڑے کے ساتھ لاطینی میں باتیں کرنے سے اسے مسیح کے گوشت اور خون میں تبدیل کر سکتا ہے ۔ حکومت انگلستان کا دعویٰ ہے کہ ہماری شہنشاہیت غلام قوموں کے لیے ایک نعمت ہے ۔ ایسے عقائد منوانے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کو بدھو رہنے دیا جائے اور انھیں بعض معاملات میں فکری قوتوں سے کام نہ لینا سکھایا جائے ۔ ایک ظالمانہ ضابطۂ اخلاق کی مثالیں حسب ذیل ہیں ۔ رومن کیتھولک فرقہ اس قسم کا قانون منوانا چاہتا ہے کہ اگر کوئی عورت کسی آتشک زدہ مرد سے حاملہ ہو جائے تو اسے مصنوعی طریقوں سے حمل کو روکنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے بلکہ اس متوقع آتشکی بچے کو پیدا ہونے دینا چاہیے تاکہ وہ دنیا میں مصیبت کے چند برس گزار کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اعراف میں رہے ۔ (بشرطیکہ اس کے والدین کیتھولک عقیدہ کے نہ ہوں) حکومت برطانیہ ہر انگریز کا فرض خیال کرتی ہے کہ جب کبھی ویسٹ منسٹر میں جمع شدہ کچھ میانے شرفاء حکم دیا کریں ، وہ ان لوگوں کو مار ڈالا کرے جو انگریز نہ ہوں ۔

یہ مثالیں اس حقیقت کے واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ حکومت اور کلیسا دونوں فراست اور نیکی کے جانی دشمن ہیں ۔

پس تعلیم سے گھر کے اثر کو کم کرنا اس وقت تک خطرناک ہوگا جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ اس کی جگہ کسے ملنے والی ہے ۔ اگر ایک ایسی عالم گیر حکومت کے وجود کو جو دینی بندھنوں سے آزاد ہو ، فرض کر لیا جائے تو اغلب ہے کہ بچوں کے لیے گھر کی قدر و قیمت بہت کم ہو جائے اور والدین کا اثر گھٹ جانے سے وہ پہلے سے زیادہ خوش و خرم اور زیادہ عقل مند بن سکیں ، لیکن موجودہ حالات میں روش کے سوا ہمیں ہر طرح کی ترقی حاصل کرنے کے لیے حکومت اور کلیسا کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور ہر وہ شے جو لوگوں کے دلوں پر ان دونوں کی گرفت کو مضبوط تر بنانے گی ، اسے تشویش کی نظر سے دیکھا جائے گا ۔

اس سوال پر کہ آیا حکومت بچوں کو والدین سے علیحدہ کر کے خود پرورش کرے ، صرف بچوں ہی کا لحاظ رکھ کر ہی نہیں ، بلکہ والدین کا لحاظ رکھ کر بھی غور کرنا چاہیے ۔ مادری پدری جذبات کا اثر نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں کے طور طریقوں پر بھی بہت گہرا پڑتا ہے ۔ ہمارے پاس ایسا مواد موجود نہیں جن کی بنا پر ہم اندازہ لگا سکیں کہ اگر یہ جذبات مردوں اور عورتوں کے دلوں سے نکال دیے جائیں تو

وہ کس قسم کے انسان بن جائیں گے ، لیکن ہم اطمینان کے ساتھ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ بہت کچھ بدل جائیں گے ؛ بہت ممکن ہے کہ ان حالات میں اکثر عورتوں کو بچوں کی خواہش ہی نہ رہے اور بچے جننا ایک ایسا اُجرت طلب پیشہ بن جائے جیسے سول سروس کی ایک شاخ کے طور پر اختیار کیا جانے لگے ۔ یہ بھی اغلب ہے کہ مرد اور عورت کے تعلقات نہایت سطحی ہو جائیں اور سنجیدہ زن و شوئی محبت کم یاب ہو جائے ؛ یہ بھی احتمال ہے کہ مردوں میں زیادہ محبت کرنے کا رجحان گھٹ جائے کیوں کہ موجودہ حالات میں ادھیڑ عمر کے آدمی کو خاندان کی ضروریات مہیا کرنے کا خیال ہی زیادہ تر محنت پر اکساتا ہے ۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ لوگ زندگی کے بیمے کے لیے بڑی بڑی رقمیں ادا کرتے ہیں ۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ انھیں اپنے مرنے کے بعد کنبے کو پیش آنے والے حالات کی فکر ہوتی ہے ۔ یہ امر مشکوک ہے کہ جس دنیا میں خاندان کا وجود ہی نہ ہو ، وہاں عام آدمی کو ما بعدالموت کے واقعات سے دل چسپی رہے گی بھی یا نہیں ۔ یہ ممکن ہے کہ تمام قوم پر اس طرح کی مفلوجی حالت چھا جائے جیسی چھتے کی رانی کے مر جانے کے بعد شہد کی مکھیوں پر چھا جایا کرتی ہے ۔ اس سلسلے میں تجربہ ہی فیصلہ کر سکتا ہے اور ابھی تک تجربہ مفقود ہے ۔

بہر حال دوسرے پہلو پر گفتگو کی کافی گنجائش ہے ۔ تمام استحصالی جذبات خطرناک ہوتے ہیں اور وہ

جذبات جو والدین میں بچوں کے بارے میں پائے جاتے ہیں، کسی طرح کم خطرناک نہیں۔ بچوں کے بارے میں والدین کے یہ احساسات حد درجہ انفرادی اور مسابقانہ قسم کے ہوتے ہیں۔ کئی وہ لوگ جو بے اولادی کے زمانے میں قومی جذبے سے سرشار ہوا کرتے تھے، باپ بنتے ہی اپنے کنبے کی بہبود میں محو ہو گئے۔ ذاتی جائداد کی خواہش بہت حد تک خاندان سے وابستہ ہے اور افلاطون سے لے کر اس وقت تک کے اشتہالی اس خیال میں حق بجانب ہیں کہ ان کے اقتصادی نظام کا مطالبہ یہ ہے کہ بچوں کے نام جائداد منتقل ہونے کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔ یہ ممکن ہے کہ والدین کے جذبات کا وہ حصہ جو قابل تعریف اور مفید ہے، کسی خاص مدرسے کی فضا میں منتقل ہو سکے یا جو جذبات بعض مخصوص لوگوں میں ہوں، انہیں عام بچوں میں منتقل کیا جا سکے؟ اگر کبھی ایسا ہو سکا تو یہ ایک بین اخلاق پیش قدمی ہوگی۔ میرے خیال میں مادری پدری جذبات شفقت ہی بے لوث خدمت کا سرچشمہ ہیں اور بعض بے اولاد عورتوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر ان جذبات کو عام کر دیا جائے تو وہ کتنے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر اسے استحصالی رنگ سے الگ کیا جا سکے جس کا وجود اس وقت تک لابدی ہے جب تک یہ حقیقی جسمانی آبائیت سے وابستہ ہے، تو شاید دنیا کی بربریت کسی حد تک کم ہو جائے اور انسان عام نوع انسان کا خیر خواہ بن جائے، لیکن

اس مفروضے کا پیش نظر رهنا ضروری هے -

گھر اور سکول کے مقابلے کا سوال ایسا هے جس کا فیصله ایک خاص حد تک عقل عمومی کی مدد سے کوئی بنیادی مسائل کھڑے کیے بغیر کیا جا سکتا هے لیکن جب هم اس نقطے سے آگے بڑھتے هیں تو انسانی نفسیات کے بارے میں اپنی لاعلمی سے دو چار هوتے هیں - هم نہیں کہه سکتے که همارے جذبات کا کتنا حصه فطری هے اور یه که اگر همارے جذبات ایسے نه رهیں جیسے که اب هیں تو ان کی شدت کا کیا عالم هوگا - امید هے که روس کچھ وقت کے بعد ایسا مواد بهم پہنچا سکے گا جس سے هم ان مسائل کے متعلق کچھ اور جان سکیں گے - اس اثنا میں سائنسی اسلوب یہی هے که هم فیصلے کو ملتوی رکھیں -

---

باب ششم

اشراف ٬ جمہوریت پرست اور ضابطہ پرست

جب سے مملکت پیدا ہوئی ہے ، سلطنت اور خاندان دو مخالف قوتیں رہی ہیں ۔ صرف شاہی خاندان ہی میں ان دونوں میں باہم جذباتی ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی تھی ۔ لا محالہ اس مفروضے نے جنم لیا کہ قوم ایک بڑا کنبہ ہے جس کا سرپرست بادشاہ ہے ۔ چنانچہ یہ خیال چین ، جاپان ، میکسیکو ، پیرو ، اور کسی حد تک ہر اس جگہ غالب رہا جہاں بادشاہ کی الوہیت کا عقیدہ زوروں پر تھا ۔ ان ذرائع سے ایک مضبوط ریاست کی تخلیق کی جا سکتی تھی ۔ جن جذبات نے لوگوں کو وفادار بنایا ان میں کچھ تو مذہبی تقدس اور کچھ خاندان کے سرپرست کا احترام تھا ۔ غیر شخصی ریاست کی تخلیق اہل یونان اور بالخصوص اہل روما نے کی ۔ بروٹس اول کا اپنے بیٹے کو عوام کے فائدے کے لیے قربان کر دینا ایک ایسی حکایت ہے جسے ہم مفاد عامہ کے مذہب کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں ۔ مشرق میں یہ مذہب بالکل نیا اور یورپی اثرات کی پیداوار ہے ۔ کنفیوشس نے

جان بوجھ کر فرزندانہ سعادت مندی کو قانون سے بالا تر رکھا تھا اور اس بیٹے کو قصور وار گردانا تھا جو اپنے مجرم باپ کو قانون کے حوالے کر دے۔ جاپان میں ابھی تک جذبۂ وطن پرستی میں اس قدیم جاں نثاری کا بہت کچھ رنگ ڈھنگ موجود ہے جو خاندان کے قدوسی الاصل سرپرست کے لیے ہوا کرتی تھی۔ جب معقولیت پسندی کے زیر اثر اس جذبے میں تخفیف ہوگی، اور جو یقیناً ہو کر رہے گی تو یہ امر مشکوک ہے کہ آیا جاپانی نظام سیاست باقی رہ سکے گا؟ اور یہ غیر اغلب نہیں کہ اس کی جگہ ایک ایسی مملکت لے لیے جو زیادہ تر روس کے نمونے کی ہو۔ چین میں پیہم کوشش کی جا رہی کہ پرانے خاندانی احساسات کی جگہ جذبۂ وطنیت پیدا کیا جا سکے۔ یہ کوشش کومن ٹانگ (Kuo min Tang) کی پارٹی اور سن یٹ سین کے قریب قریب مذہبی تقدس واحترام پر مرتکز رہی ہے۔ ہندوستان میں انگریز سے نفرت کے توسط سے جدید جذبۂ وطنیت ترقی پا رہا ہے، لیکن ان تمام ممالک میں چونکہ رومن روایت نہیں ہیں اس لیے وطنیت کا جذبہ جن معنوں میں اسے ہم سمجھتے ہیں، ابھی قدرے بدیسی معلوم ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں انگلستان کے اونچے طبقے کو اہل روما کے جذبات تک قریب ترین رسائی حاصل ہے۔ انقلاب فرانس تک دوسرے ممالک میں ریاست بادشاہ کی شخصیت میں متشکل ہوا کرتی تھی۔ انگلستان میں چارلس اول کے

قتل کے بعد ریاست اور بادشاہ کی ذات لوگوں کے دلوں میں واضح طور پر دو الگ الگ چیزیں تھیں - سنہ ۱٦۸۸ء سے لے کر سنہ ۱۸۲۲ء تک کے سارے زمانے میں انگلستان کی حکومت عملی طور پر اشراف جمہوریت تھی جس میں انگلستان کے حکمران خاندانوں میں مفاد عامہ کا تقریباً وہ فطری احساس موجودہ تھا جو اہل روما میں ان کے عہد زریں میں پایا جاتا تھا - میرا یہ مقصد نہیں کہ انگلستان یا روما میں کہیں بھی طبقۂ اشراف نے اپنے ذاتی مفاد سے بے پروائی اختیار کی ہو - بروٹس دوم نے جسے جمہوری اوصاف کا نمونہ سمجھا جاتا ہے ، ایک بلدیہ کو ساٹھ فی صدی شرح سود پر روپیہ قرض دیا تھا اور جب وہ سود ادا کرنے سے قاصر رہی تو اس نے محاصرے کے لیے نجی فوج جمع کی - انگلستان میں اٹھارھویں صدی کے طبقۂ اشراف نے دارالعوام اور دارالامرا دونوں پر اپنے اقتدار کو اس مطلب کے لیے استعمال کیا کہ قانونی حد بندی کے ذریعے سے عوام کے حقوق کو غصب کیا جا سکے - اس کے باوجود دونوں ملکوں کے امرا نے ریاست کو اس طریقے سے اپنی ذاتی چیز سمجھا کہ عہد حاضر کی وسیع جمہوریتوں میں شاید ھی کوئی فرد ایسا کر سکے -

ہر سماجی نظام کا ایک موزوں تعلیمی آلۂ کار ہوتا ہے - اہل انگلستان کی بلدیہ نے یہ کام پبلک سکولوں سے لیا - ان میں ایٹن کا سکول سب سے پہلا اور سب سے پیش پیش تھا لیکن دوسرے ایسے مدرسے بھی تھے جو کمتر

درجے کے تھے ، جیسے ہیرو ، مانچسٹر اور رگبی ۔ ان مدرسوں کی کار گزاری سے اٹھارھویں صدی کے طبقۂ اشراف کی ذہنیت برائے نام گہری دستوری تبدیلیوں کے باوجود انیسویں صدی کے سیاسی اقتدار کے مالکوں کی سی رہی ۔ یہ پبلک سکول اب تک موجود ہیں اور اکثر آسودہ حال انگریزوں کے خیال میں وہ ہماری بہترین روایات کے مظہر ہیں ، اس لیے ہمیں یہ غور اس امر کا جائزہ لینا چاہیے کہ ان مدرسوں نے ہماری قومی زندگی میں کیا حصہ لیا ہے ۔

نفسیاتی طور پر ابتدائی مدرسوں اور پبلک سکولوں کے نظام کا نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ وہ بچپن ہی میں بچے کو خاندان اور عورتوں کے اثرات سے جدا کر دیتے ہیں اور اسے اپنے سے بڑے لڑکوں کی بد سلوکی اور ہم عمروں کی امکانی دشمنی کا تختۂ مشق بننے کے لیے بے یارومددگار چھوڑ دیتے ہیں ۔ چنانچہ شفقت اور مامتا اس تمام خواہش کو جو بچپن سے اس کے شامل حال ہوتی ہے اور جس کو وہ پورے طور پر دبا نہیں سکتا ، اس کے بارے میں وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ دوسرے طلبہ کو ان کا مرکز بنائے ۔ اول اول ممکن ہے کہ وہ بہت ناخوش رہے لیکن آہستہ آہستہ ، بشرطیکہ وہ عام لڑکوں سے زیادہ ذکی الحس ذہین نہ ہو ، وہ بچاؤ کی زرہ پہن کر بظاہر سنگ دل دکھائی دینا سیکھ جاتا ہے ۔ وہ مدرسے میں تمام دوسری چیزوں سے قطع نظر کر کے اقتدار اور شہرت کو نصب العین بناتا ہے ۔ اگر وہ اچھا کھلاڑی ہے تو اسے سکول میں وہ وقار

نصیب ہوگا جو اسے بعد کی زندگی میں بھی اس وقت تک حاصل نہ ہوگا جب تک وہ قومی زندگی میں کافی اونچا مقام حاصل نہ کرلے ۔ مدرسے کی زندگی کے آخری سالوں میں جب چھوٹے طلبہ کی طرف سے اس کا احترام کیا جاتا ہے اور ان پر اسے اقتدار حاصل ہوتا ہے ، وہ ابتدائی رنجیدگی کو بھول بھال جاتا ہے اور جب وہ چالیس برس کی عمر تک پہنچتا ہے تو یہ سوچنے لگتا ہے کہ گو مدرسے کے ایام اس کی زندگی کے بہترین دن تھے لیکن اس زمانے میں اسے جو مسرت بھی حاصل ہوتی تھی ، وہ اپنے اقتدار کا نتیجہ تھی جو بالکل بے حیثیت تھا ، اور ایسے اوصاف کی تعریف و تحسین سے پیدا ہوئی تھی جن کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی ۔ بعد کی زندگی میں وہ فطری طور پر ایسی لطف اندوزی کے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے ، وہ حکومت کرنے کے لیے رعایا چاہتا ہے ، جس کی نگاہ میں وہ دیوتاؤں کا سا وقار رکھتا ہو ، اس لیے وہ غیر متمدن لوگوں میں یا کم از کم ایسے لوگوں میں جنھیں وہ غیر متمدن سمجھتا ہے ، جاکر رہنے لگتا ہے ۔ وہ اپنے آپ کو سلطنت کا معمار اور ثقافت کا آخری ستون سمجھنے لگتا ہے ، جس کا مقصد یہ ہے کہ مغربی روشنی کو دنیا کے تاریک مقامات تک پہنچا دے ۔ اگر دیسی باشندے اس کا اسی طرح احترام کرتے رہیں جیسا کہ مدرسے کے آخری ایام میں چھوٹے لڑکے کیا کرتے تھے تو وہ اس امر کو بالکل اطمینان بخش سمجھتا ہے ۔ وہ مہربان ، شفیق ، دیانت دار اور محنتی رہتا ہے اور تنہائی اور تکلیفوں کو حوصلے سے برداشت کرتا ہے ،

کیونکہ وہ کسی حالت میں بھی ان تکالیف سے زیادہ ناخوشگوار نہیں ہو سکتیں جو اسے مدرسے کے ایام میں پیش آئی تھیں۔

لیکن اگر دیسی باشندے اس کی مدح سرائی نہیں کرتے تو اس کے وجود میں کسی قدر ناگواری پیدا ہو جاتی ہے۔ جب اسے وحشیوں سے واسطہ پڑتا ہے جہاں اس کی بڑائی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی تو وہ اکثر دلیری اور بردباری کی وجہ سے کامیاب ہوتا ہے، لیکن غیر ملکی تہذیبوں مثلاً مشرقی تہذیبوں سے واسطہ پڑنے کی صورت میں اس کی حالت قابل رحم ہو جاتی ہے۔ میں نے جب کبھی مشرق میں ان لوگوں کو جو اپنے آپ کو پبلک سکولوں کا لطیف ترین پھول خیال کرتے تھے، مشرق کے عالم لوگوں سے گفتگو کرتے دیکھا ہے، مجھے اپنے انگریز ہونے پر شرم محسوس ہوئی ہے۔ ممکن ہے میرے اہل وطن سرخ چہرہ ہوں، بلا کے شراب نوش ہوں، اپنے کام کاج کے اوقات کو لوٹ کھسوٹ میں اور اوقات فرصت کو شکار اور برج میں بسر کرتے ہوں، لیکن مغربی تہذیب سے قطعاً نا بلد اور اس امر سے قطعاً نا آشنا ہوں کہ مشرقی تہذیب کا بھی کوئی وجود ہے۔ پھر بھی جب انھیں ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو نہ صرف اپنی تہذیب کے متعلق وہ سب کچھ جانتے ہیں جو جاننا چاہیے بلکہ مغربی تہذیب کے متعلق بھی پبلک سکولوں کے فارغ التحصیل لوگوں کے مقابلے میں بہت زیادہ جانتے ہیں، تو یہ جاہل گنوار فوجی فاتحین کی سی بدتمیزی کو

بر قرار رکھنا چاھتے ھیں اور اس امر پر قانع ھوتے ھیں کہ اپنی بڑائی کو جنگی جہازوں کی توپوں کے زور سے ثابت کریں - چنانچہ جاپانیوں نے اس ناقابل نفرت سنگ دلی کا جواب ھمارے معیار کو اپنا نے سے دیا ھے اور مشرق کی باقی اقوام بھی ان کی پیروی کر رھی ھیں - بہرحال پبلک سکول شاھنشاھیت کے انجنوں کی حیثیت سے ناکام رھے ھیں -

اس ناکامی کے اسباب کچھ تو عقلی ھیں اور کچھ نفسیاتی - ھم عقلی اسباب سے آغاز کریں گے جو سطح سے زیادہ قریب ھیں - پبلک سکولوں کی روح عقل کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ھے ، خصوصیت سے سائنسی عقل کو - اساتذہ کا انتخاب ان کے ورزشی اوصاف کی بنا پر کیا جاتا ھے ، انھیں کم از کم ظاھری طور پر ایک مکمل ضابطۂ کردار کا پابند رھنا پڑتا ھے جس میں مذھب، سیاست معاشرت اور اخلاق سبھی آجاتے ھیں اور جو بیشتر فہیم لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ھوتا ھے - ان کے لیے ضروری ھوتا ھے کہ لڑکوں کو ھمیشہ مصروف رھنے پر اس طرح اکساتے رھیں کہ انھیں جنسی گناہ کا موقع ھی نہ ملے ، بلکہ پایان کار انھیں سوچنے کا وقت بھی نہ ملے - انھیں ان بچے کھچے ذھنی آثار کی حوصلہ فرمائی بھی کرنی ھوتی ھے جو زیادہ ھوشیار لڑکوں میں کہیں کہیں باقی رہ گئے ھوں اور انجام کار انھیں ایک ایسی ”تیار شدہ شے“ باھر بھیجنی چاھیے جس میں ظاھر دارانہ نفاست کا جنون اس حد تک ھو کہ زندگی بھر کسی اھم چیز کے سیکھنے کی صلاحیت

ہی پیدا نہ کر سکے ۔ ہمارے پبلک سکولوں کے یہ چند عقلی نقائص ہیں جنہیں اس حقیقت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان سکولوں کے قیام کا مقصد ہی ایک ایسے نظام کو سہارا دینا ہے جس کی عقلی طور پر حمایت نہیں کی جا سکتی ۔

ابتدائی مدرسوں اور پبلک سکولوں کے نفسیاتی نقائص کے اسباب زیادہ تر دو ہیں ، یعنی لڑکوں کا نسوانی رفاقت سے محروم ہو جانا اور رسمی ضابطۂ اخلاق ۔ چھوٹے بچے ابتدا میں لازماً ماؤں ، بڑی بہنوں بلکہ دایاؤں کی شفقت کی کمی کو محسوس کرتے ہیں ؛ ان حالات میں مائیں بچوں کی بہت ہی زیادہ پوشیدہ محبت اور جذبۂ پرستش کا موضوع بن جاتی ہیں ، یہ جذبات اس وجہ سے اور بھی زیادہ شدید ہو جاتے ہیں کہ آداب فیشن کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ آدمی تمام عورتوں سے نفرت کا دعویٰ کرے ۔ سن بلوغ کے بعد ان کا رجحان جلق یا اغلام یا دونوں کی طرف ہو جاتا ہے ۔ ان میں سے اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کام حقیقت میں برا ہے لہذا وہ اسے چوری چھپے کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ جنسی لغزش کو سب اہل الرائے بہ نظر حقارت دیکھتے ہیں ۔ ان حالات میں اکثر لڑکوں کے دلوں میں ماں کی شبیہ بڑھ چڑھ کر اس عورت کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو حیوانی آلائش سے مبرا محبت کی روح پھونکتی ہے ۔ ایسے جذبات عام طور ایک مسرت خیز شادی کو ناممکن بنا دیتے ہیں اور بعض اوقات ہر ایسی عورت سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے جس کے

ساتھ مباشرت ممکن ہو؛ جو نا خوشی اس نفسیاتی الجھن سے پیدا ہوتی ہے، عموماً بے رحمی پیدا کرتی ہے اور صرف اقتدار ہی کو مسرت کا قابل حصول سرچشمہ قرار دیتی ہے۔ اس طرح شہنشاہیت کے ان ہوا خواہوں کی ذہنیتیں ان دماغی اوہام کی وجہ سے جو جنسی بھوک سے پیدا ہوتے ہیں، اور مضبوط ہو جاتی ہیں۔

انگریزی پبلک سکولوں میں جو نقائص پائے جاتے ہیں غالباً وہ سب اشراف کے تعلیمی نظام کے اجزائے لاینفک ہیں، بلکہ ان میں سے بیشتر کا ہر ایسے معاشرے میں پایا جانا اغلب ہے جہاں موروثی طور پر ساجی امتیاز کی کوئی حامل جماعت موجود ہو۔ عموماً ایسی جماعت کا نصب العین استداد حکم رانی ہوگا، اس لیے یہ فراست یا ادراک کے بجائے قوت ارادی کی نشو و نما کرے گی اور اس تربیت میں زہر کے ایسے عناصر کو ضرور شامل کرے گی جو قوت ارادی کے مضبوط بنانے میں مفید ہوں۔ دولت کے زیر اثر اشراف کا طبقہ گزشتہ زمانوں میں یا تو عیش پرستی کے طفیل سہل پسند بن جاتا رہا یا آزادیٔ رائے کی ترقی سے جھکنے پر مجبور ہو جاتا رہا۔ اگر ان خطرات کا سد باب نہ کیا جائے تو کوئی اشرافیت دیر تک زندہ نہیں رہ سکتی اس لیے انگریزی پبلک سکولوں کے نقائص اور محاسن اشراف کے ایسے طبقے کی تعلیم کے لیے ضروری ہیں جو خود قائم و دائم ہو۔ اب اشرافیت تقویم پارینہ بن چکی ہے اور انگلستان کو جو اسے برقرار رکھے چلا آرہا ہے، لوگ یوں تعجب کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں جیسے

تھیلی دار جانوروں کی تعجب خیز بقا کو دیکھتے ہیں۔ اسی بنا پر، نہ کہ کسی جزوی غلطی کی بنا پر ایٹن کے پبلک سکول کو اب وہ اہمیت حاصل نہیں رہی جو آج سے ایک سو برس پہلے تھی۔ عہد حاضر میں جو نظام تعلیم بنی لوگوں کی زندگی میں اپنا موزوں مقام حاصل کرنا چاہے گا وہ لازماً نظام اشرافیت کے علاوہ کوئی اور نظام ہوگا۔

خالص جمہوری نظام تعلیم کے نقائص بھی اگر زیادہ نہیں تو نظام اشرافیت کے برابر ضرور ہیں۔ جذباتی لحاظ سے جمہوریت کے دو پہلو ہیں: جب جمہوریت کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ فریق ثانی کے برابر ہی اچھی ہے تو یہ چیز خوش آیند ہوتی ہے لیکن جب وہ یہ دعویٰ کرتی ہے کہ فریق ثانی مجھ سے کسی طرح بہتر نہیں تو یہ ایک قسم کا جبر بن جاتی ہے اور غیر معمولی قابلیت کی نشو ونما میں حائل ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو زیادہ صحیح طور پر یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ جمہوریت اس حالت میں تو ایک اچھی چیز ہے جب یہ انسان میں جذبۂ خودداری کو بیدار کرے لیکن اس حالت میں بری ہے جب یہ عوام کو اس بات پر اکسائے کہ وہ غیر معمولی قابلیت کے لوگوں کو دکھ دیں۔ اس قسم کی ایذا رسانی بلا شبہ اشرافی سکولوں میں بھی موجود ہے جہاں غیر معمولی قابلیت کے لڑکوں سے اکثر بہت برا سلوک کیا جاتا ہے۔ بہر حال جمہوریت ہی ہے جس میں ایسی چیز نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کو اختیار کر لیتی ہے اور مدرسے

کی چار دیواری سے نکل کر دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ غیرمعمولی مزاج کے انسانوں کے ساتھ رواداری، جو انگریزی تمدن کے بہترین خدوخال میں شمار ہوتی ہے، اشرافیت ہی سے متعلق ہے۔ گو بائرن اور شیلے معاشری ایذا رسانی کے ہاتھوں تنگ ہوئے لیکن یہ ایذا رسانی اس سے کم تھی جس سے انھیں کسی جمہوریت میں دو چار ہونا پڑتا۔ نیز وہ اسے اس سے کہیں بہتر طریقے پر برداشت کرنے کے قابل نکلے، جیسے وہ اشرافی خود حرمتی کے بغیر برداشت کر سکتے۔

بہر حال جمہوری نظام تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہی نہیں؛ امریکہ میں بھی جہاں جمہوریت کا جذبہ زوروں پر ہے، ایسے تعلیمی نظاموں کا وضع کرنا مشکل ہے جن کی مدد سے زیادہ ہوشیار بچوں کو ضروری سہولتیں مل جائیں۔ ابھی ابھی اس سلسلے میں جو کچھ کیا گیا ہے، وہ زیادہ تر ان لوگوں کی وجہ سے ہوا ہے، جو نظام جمہوریت کے مخالف ہیں۔ ظاہر ہے کہ بعض بچے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ اگر ان ذہین لڑکوں کو بھی قوم کے لیے حتی الامکان مسرت انگیز اور مفید ثابت ہونا ہے تو ان کے لیے ایسے سلوک کی ضرورت ہے جو اس سلوک سے مختلف ہو جو اوسط درجے کے لڑکوں سے کیا جاتا ہے۔ اشرافیت کی غلطی یہ نہیں تھی کہ اس نے بعض لوگوں کو دوسروں سے برتر سمجھا بلکہ یہ کہ اس نے برتری کو موروثی فرض کر لیا۔ جمہوریت کی غلطی یہ ہے کہ اس نے بڑائی کے تمام دعووں کو عوام

کی ناراضگی کی جائز وجہ قرار دے دیا ۔ عہد حاضر میں بہت سے ایسے کام جو جماعت کی بہتری کے لیے ضروری ہیں عام قابلیت سے کچھ زیادہ قابلیت کا تقاضا کرتے ہیں ۔ ان کاموں کے سر انجام دینے کے لیے غیرمعمولی لوگوں کے انتخاب کا کوئی طریق ہونا چاہیے ۔ فی الجملہ اگر انہیں اتنا ہی قابل بنانا ہے جتنا ممکن ہے تو پسندیدہ صورت یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو بچپن ہی میں ، مثلاً جب وہ بارہ برس کے ہوں ، منتخب کر لیا جائے اور انہیں اس سے بہت زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی کرنے کی اجازت دے دی جائے جو اوسط درجے کے لڑکے لڑکیوں کی کسی جماعت میں ممکن ہوتی ۔ یہ احساس کہ بعض بہترین لڑکوں کو الگ چھانٹ لینا ایک غیر جمہوری عمل ہے ، بہت سے عمدہ مواد کے ضائع ہونے کا موجب بنتا ہے ۔ ہم اس موضوع کا بارھویں باب میں پھر ذکر کریں گے ، سر دست میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہوں گا کہ مصیبت کا سر چشمہ بے قابو جمہوری جذبات ہیں ، نہ کہ جمہوری طرزحکومت۔ سیاسی لحاظ سے فرانس بھی امریکہ کی طرح ایک جمہوریت ہے لیکن وھاں قابل لڑکوں سے امتیازی سلوک کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کیوں کہ عقلی اور فنی استعداد کا احترام کیا جاتا ہے ۔ نہ صرف اس وقت جب وہ بہت شہرت حاصل کر لے بلکہ اس وقت بھی جب وہ نشوونما پانے کے دور میں ہو ۔

ایک نظریے کی حیثیت سے اب جمہوریت کی گرفت لوگوں کے دلوں پر اتنی نہیں رہی جتنی جنگ سے پہلے

تھی ۔ یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ایک صنعتی معاشرے میں اقتدار کی چند کلیدی آسامیاں ہوتی ہیں جو اگر غیر سرکاری مال دار آدمیوں کے ہاتھوں میں نہ ہوں تو لازماً سرکاری ملازموں کے ہاتھ میں ہوں گی جو بعید طور پر تو عوامی اختیار کے ماتحت ہوں گے لیکن اکثر حالات میں بڑے بڑے اہم فیصلے اپنی قوت فیصلہ کے مطابق کریں گے ۔ ہم اس طرح اشراف اور دولت مندوں کی حکومت کے عمل متبادل کے طور پر دفتریت پرست نظام پر پہنچ جاتے ہیں ۔ اگر ناجائز رعایتوں کا سد باب کرنے کے لیے امکان بھر کوشش کی جائے تو بھی طاقت کی تقسیم نامساوی ہی رہے گی کیوں کہ یہ چیز ناگزیر ہے ، لیکن طاقت ان لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی جو اسے استعمال کرنے کے بہترین اہل ہوں گے ، لیکن اس اقتدار کی حیثیت غیر ذمہ دارانہ نہیں ہوگی جیسا کہ دولت مندوں اور بادشاہوں کے ہاتھوں میں ہو سکتی ہے ۔ یہ طاقت ایسی طاقت ہوگی جو انجام کار جمہور کے اختیار میں ہوگی ۔ جن لوگوں کو اس طاقت کا استعمال عقل مندی سے کرنا ہے ، ان میں ایسے اوصاف ہونے چاہییں جو ان اوصاف سے کسی قدر مختلف ہوں جو جمہوریت اور اشرافیت کے نظام ہائے تعلیم سے پیدا ہوتے ہیں ۔ ان میں غیر جمہوری عنصر یہ ہوگا کہ وہ قابلیت اور علم میں اوسط سے واضح طور پر بلند ہوں گے اور غیر اشراقی عنصر یہ کہ ان کے منصب کا مدار ان کے والدین کی معاشری حیثیت پر نہیں بلکہ اپنی ذاتی قابلیتوں پر ہوگا اور چونکہ ان کے

اختیارات قطعی اور حتمی نہ ہوں گے اس لیے انہیں حکمرانی کی خصوصی صلاحیت کی ضرورت نہ پڑے گی۔ انہیں صرف صحیح فیصلے پر پہنچنے اور اپنے سے کمتر دماغوں کے لوگوں کو اس کے اسباب سمجھانے کے لیے غیر معمولی استعداد کی ضرورت ہوگی۔

یہ امر واضح ہے کہ جوں جوں ہمارا معاشرہ زیادہ سے زیادہ عضویاتی ہوتا جاتا ہے، جو عہد حاضر کی ایجادات اور ٹکنیک کا لازمی نتیجہ ہے، دفتریت کی اہمیت باقاعدہ بڑھتی چلی جا رہی ہے، اس لیے ایک سائنسی ریاست میں ان لوگوں کی صحیح تربیت نہایت اہم ہے جن کو افسر بننا ہے۔ پس اساتذہ اور محکمۂ تعلیم کے افسروں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ فطری قابلیت کا احترام کریں اور اسے ڈھونڈ نکالنے کے طریقے سوچیں، اس لیے ضرورت ہے کہ زیادہ فہیم طلبہ کے لیے الگ جماعتیں ہوں؛ ایک ایسا نصاب ہو جو نہ صرف کشادہ ذہن، بلند نگاہ بلکہ مخصوص فنی علم عطا کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہو۔ یہ رجحان فکر عام ہے کہ جو علم مفید ہیں ان سے ثقافت پیدا نہیں ہوتی اور جن سے ثقافت پیدا ہوتی ہے وہ مفید نہیں، میں اسے ایک دھوکا سمجھتا ہوں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اہل یونان اور اہل سپارٹا کی لڑائیوں کے حالات پڑھنے سے انسان ثقافت سیکھتا ہے لیکن انقلاب روس کے حالات کا جاننا بے سود اور قابل مذمت ہے۔ اس قسم کے خیالات نہ صرف مفید علوم کے حاصل کرنے ہی میں رکاوٹ ہیں بلکہ ایسی معقول ثقافت کے حصول

میں بھی مزاحم ہیں جس میں ایسی وسعت اور جامعیت ہو جس سے نمائش پسند مدعیان علم اسے محروم کر رہے ہیں۔

دفتریت پسند حاکموں کی تعلیم ایک خاص نوعیت کی شہریت کی تعلیم ہوگی لیکن اسے بھی اس وقت تک درست تعلیم نہیں کہہ سکتے جب تک بعض علوم کو روایتی ہونے کی بنا پر خاص اہمیت حاصل رہے گی۔ بعض دیگر شعبہ ہائے علوم کو اس بنا پر غیر اہم گردانا جائے گا کہ ملا منش لوگ ان کے حامل نہیں۔ نشاۃ ثانیہ کے وقت اچھے ادبی علوم لاطینی اور یونانی میں تھے مگر اب یہ حالت نہیں؛ انگریزی پبلک سکولوں کے اکثر استاد تا حال اس حقیقت سے نا آشنا ہیں اور اب بھی حکومت برطانیہ سول سروس کے لیے زیادہ تر ان لوگوں کا انتخاب کرتی ہے جنھیں کلاسیکی زبانوں میں مہارت حاصل ہوتی ہے، حالانکہ فرانسیسی اور جرمن زبانوں کا جاننا زیادہ مفید اور زیادہ ثقافتی قیمت کا حامل ہو سکتا ہے۔ ثقافت کے روایتی مفہوم میں جو تنگی موجود ہے وہ ایک بڑی حد تک عام لوگوں کی نظروں میں ثقافت کی بدنامی کی ذمہ دار ہے۔ حقیقی ثقافت اس کا نام ہے کہ انسان خود کو آفاق شہری خیال کر لے نہ کہ زمین کے کسی اٹکل بے جوڑ طور پر وضع کیے گئے ٹکڑے کا باشندہ سمجھے۔ اس سے انسان کو مجموعی طور پر انسانی معاشرے کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے، نیز وہ درست اندازہ لگا سکتا ہے کہ قوموں کو کون سے مقاصد

پورے کرنے چاہییں ؟ اس سے ماضی اور مستقبل کی روشنی میں حال کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ، اس لیے حقیقی ثقافت ان لوگوں کے لیے بہت قیمتی چیز ہے جن کو اقتدار سنبھالنا ہو ۔ یہ ان کے لیے اتنی ہی مفید ہے جتنی کہ مفصل و مستند معلومات ۔ انسانوں کو مفید بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں عقل مند بنایا جائے اور ایک جامع دماغ دانش مندی کا ضروری جزو ہے ۔

باب ہفتم

تعلیم میں انبوہ کا مقام

کسی فرد کے کردار کی تشکیل کے سلسلے میں جو عناصر بہت اہم ہیں ان میں ایک عنصر یہ ہے کہ بچپن اور جوانی میں فرد پر جماعت کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ہم آہنگ شخصیت کی تعمیر میں جو ناکامیاں ہوتی ہیں ان میں سے اکثر کا سبب وہ مناقشت ہوتی ہے جو دو ایسی جماعتوں میں پائی جاتی ہو جن کے ساتھ بچوں کو تعلق ہو۔ بعض ناکامیوں کی وجہ وہ مناقشت بھی ہوتی ہے جو جماعت اور فرد کے مذاق میں پائی جاتی ہو۔ تعلیم میں یہ خیال رکھنا نہایت ضروری ہے کہ جماعت کا اثر فرد پر حد سے آگے نہ بڑھنے پائے اور نیز یہ کہ اس کا عمل مضر ہونے کے بجائے مفید ہو۔

بہت سے چھوٹے بچے دو مختلف جماعتوں کے زیر اثر ہوتے ہیں جنہیں ہم بالترتیب بڑی جماعت اور چھوٹی جماعت کہہ سکتے ہیں؛ بڑی جماعت صرف چھوٹے بچوں ہی پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ سارے معاشرے سے عبارت ہوتی ہے جس سے بچہ تعلق رکھتا ہے اور جس میں چھوٹے بڑے سب شامل ہوتے ہیں؛ اس چیز کا انحصار زیادہ تر بچے کے گھر پر ہوتا ہے، سوائے ان صورتوں کے جہاں گھر

اور مدرسے میں ان تارکان وطن کے بچوں کی طرح جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سکونت اختیار کرتے ہیں ، بین مناقشت پائی جائے ، لیکن جو وقت لڑکا یا لڑکی مدرسے میں گزارتے ہیں اس وقت بڑی جماعت کی اہمیت چھوٹی جماعت کے مقابلے میں جو ہم مکتبوں پر مشتمل ہوتی ہے ، گھٹ جاتی ہے ۔ انسانوں کی تمام ان جماعتوں میں جہاں وہ ایک دوسرے سے بہت قریب رہنے کے عادی ہوں ، جماعتی احساس پیدا ہو جاتا ہے جس کا اظہار ان کے کردار کی ایک مخصوص فطری ہم آہنگی کی شکل میں ہوتا ہے اور اس شخص کی مخالفت کی شکل میں بھی جو اس قرب کے باوجود جماعت میں سے نہ سمجھا جائے ؛ مدرسے کے ہر نئے لڑکے پر ایک ایسا وقت گزرتا ہے جب وہ لوگ جو پہلے سے مدرسے کی اجتماعیت میں شامل ہیں ، اسے غیر دوستانہ شبہے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ اگر لڑکا کسی بات میں نرالا نہیں تو اسے جلد ہی برادری میں قبول کر لیا جاتا ہے ، چنانچہ وہ وہی کام کرنے لگتا ہے جو دوسرے کر رہے ہوتے ہیں ، ویسا ہی محسوس کرنے لگتا ہے جیسا دوسرے محسوس کرتے ہیں ، اسی طرح سوچنے لگتا ہے جیسے وہ سوچتے ہیں ۔ اگر اس کے برعکس وہ لڑکا کسی پہلو سے فوق العادۃ ہے تو دو صورتوں میں سے ایک ممکن ہو سکتی ہے ؛ یا تو وہ اس ہجوم کا سرغنہ بن جائے گا اور یا ایک ستایا جانے والا عجوبہ بن کر رہے گا ۔ بہت شاذ ایسے بھی ہوں گے جو غیر معمولی نیک طبعی اور نرالے مزاج کو یک جا کرنے سے دیوانے پن کی کھلی چھٹی حاصل

کریں گے جس طرح شیلے نے ایٹن میں کیا تھا۔

رسمی قسم کے بچوں کو مدرسے کے ایام میں فوراً اور تقریباً فطری طور پر اس امر کا احساس ہو جاتا ہے کہ اس جماعت کا رسمی ممبر بننے کے لیے ان میں کون سے اوصاف ہونے چاہئیں اور یہی چیز بعد کی زندگی میں معمولی عزت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اگر کسی کلب کا کوئی رکن ایسی حرکت کر بیٹھے جو مکمل طور پر درست نہ ہو تو ایک آدمی بچپن کے زمانے کے اس سلوک کو ذہن میں لائے گا جو عجیب و غریب قسم کے لڑکوں سے روا رکھا جاتا تھا؛ چنانچہ جب وہ بالغ لوگوں کے تمدن سے ہم آہنگ ہونے کے لیے اپنے کردار میں تبدیلی بھی پیدا کرے گا تو اس بنیادی نقشے کو جو اس نے زندگی کے ابتدائی ایام میں بنایا تھا، اب بھی باقی رکھے گا۔ یہ ہے وہ حقیقی اور مؤثر اخلاق ضابطہ جس کے ماتحت لوگوں کو رکھا جاتا ہے۔ ایک انسان بداخلاقیوں کا مرتکب ہو سکتا ہے، اس سے غیر قانونی افعال سر زد ہو سکتے ہیں، وہ سنگ دل اور ظالم بن سکتا ہے اور اسی طرح کسی مناسب موقع پر بدخو بھی، لیکن اسے کسی حالت میں بھی کوئی ایسی حرکت نہ کرنی چاہیے کہ خود اس کی جماعت کے لوگ اس سے احتراز کرنے لگیں؛ وہ کون کون سے افعال ہو سکتے ہیں، اس کا انحصار بلا شبہ ملک، زمانے اور متعلقہ سماج پر ہے لیکن ہر ملک، ہر زمانے اور ہر سماج میں یہ چیزیں موجود ضرور ہیں۔

تقریباً ہر مرد اور عورت کے دل میں انبوہ کا ڈر

بری طرح جاگزیں ہوتا ہے اور سب سے پہلے یہ ڈر مدرسے ہی میں بویا جاتا ہے اس لیے اخلاق تربیت میں یہ امر نہایت اہم ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مدرسے کی یہ برادری جن چیزوں کے لیے سزا دے وہ حقیقتاً نازیبا ہوں اور ان کو بدلنا لڑکے کی استطاعت میں ہو، لیکن ایسا بندوبست کرنا حد درجہ مشکل ہے۔ لڑکوں کے ہجوم کا فطری ضابطۂ اخلاق اصولی طور پر بہت بلند نہیں ہوا کرتا؛ جن چیزوں کے متعلق بہت امکان ہے کہ وہ ان کے لیے سزا دیں گے، وہ ایسی چیزیں ہیں جو ان کے مجرموں کی طاقت میں نہیں۔ جس بچے کے چہرے پر کوئی پیدائشی داغ ہو، جس کے منہ سے بدبو آتی ہو، اسے سکول میں شدید تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا اور سو میں سے کسی ایک لڑکے کے دل میں بھی یہ خیال نہیں آئے گا کہ وہ رحم کا مستحق ہے۔ میری رائے میں یہ شے ناگزیر نہیں، میرا خیال ہے کہ لڑکوں کو زیادہ مشفقانہ رویہ سکھایا جا سکتا ہے لیکن یہ معاملہ ہے مشکل اور وہ مدرس جو دلیری کے وصف کے قدردان ہوتے ہیں، ان سے اس سلسلے میں کچھ زیادہ کرنے کی امید نہیں۔

جن لڑکوں کی بڑی جماعت کسی خاص لحاظ سے مدرسے کی چھوٹی جماعت کے خلاف ہو ان کا معاملہ سماجی لحاظ سے نہیں بلکہ انفرادی لحاظ سے زیادہ سنگین ہے؛ مثلاً وہ یہودی لڑکے جو کسی ایسے سکول میں ہوں جہاں غیر یہودی لڑکوں کی اکثریت ہو۔ اکثر یہودیوں کو بڑے بڑے روادار معاشروں میں

بھی بچپن میں اپنی قومیت کی بنا پر ذلت کا تختۂ مشق
بننا پڑتا ہے؛ یہ ذلتیں ان کے ذہن میں محفوظ رہتی
ہیں اور زندگی اور سماج کے بارے میں ان کے سارے
نقطۂ نگاہ کو رنگ دیتی ہیں۔ ممکن ہے ایک بچے کو
گھر میں یہودی ہونے پر فخر کرنا سکھایا جائے،
نیز ممکن ہے اس نے اپنی فراست سے یہ جان لیا ہو
کہ یہودی تمدن تمام مغربی اقوام کے تمدن سے قدیم
تر ہے اور یہودیوں کے کارنامے ان کی تعداد کے تناسب
کے لحاظ سے دوسری اقوام کے مقابلے میں بدرجہا
زیادہ ہیں، اس کے باوجود جب وہ دوسرے بچوں
کو اپنے پیچھے تمسخر آمیز لہجے میں طنزیہ نعرے
لگاتے ہوئے سنے گا تو اس کے لیے یہ یاد رکھنا مشکل
ہو جائے گا کہ یہودی ہونا کوئی اچھی بات ہے، اور
اگر اسے یہ بات یاد وہ بھی جائے تو یہ یاد تحقیر آمیز
بے پروائی کے ساتھ آئے گی، اس طریقے سے اس کی روح
میں مدرسے اور گھر کے معیاروں کے درمیان پھوٹ جڑ
پکڑ جاتی ہے، یہ پھوٹ بہت بڑے عصباتی تناؤ اور گہرے
فطری خوف کا سبب بن جاتی ہے - یہودی قومیت سے
قطع نظر اس صورت حال کے خلاف دو مخصوص رد عمل
ہوئے ہیں؛ اول انقلابیت کا اور دوسرا کاسہ لیسی کا -
کارل مارکس اور ڈسرائیلی (Disraeli) کو ان دونوں قسم
کے رد عمل کی انتہائی صورتیں شمار کیا جا سکتا ہے -
موجودہ نظام کے خلاف کارل مارکس کے دل میں جو نفرت
پیدا ہوئی، ممکن ہے اگر وہ غیر یہودی ہوتا تو اسے

محسوس نہ کرتا ، لیکن چونکہ وہ اس قدر ذی فہم تھا کہ غیر یہودیوں سے محض اسی بنا پر نفرت نہ کر سکتا تھا اس لیے اس نے اپنی نفرت کا رخ غیر یہودیوں سے مجموعی طور پر ہٹا کر سرمایہ داروں کی طرف پھیر دیا اور چونکہ درحقیقت سرمایہ دار عام طور پر قابل نفرت شمار ہوتے تھے اس لیے وہ انھیں قابل نفرت شمار کرتے ہوئے ایک ایسا نظریہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کی رو سے معاشرے میں ان کے مقام کا قریباً قریباً صحیح تعین ہو گیا ڈسرائیلی نے جو نسلاً یہودی اور مذھباً عیسائی تھا ، اس حالت کا ایک اور طریقے سے مقابلہ کیا ؛ اس نے اشرافیت کے ٹھاٹھ اور شخصی حکومت کے تزک و احتشام کو نہایت خلوص سے سراھا ۔ اس نے دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا کہ اس نظام میں پائداری ھے ، ایذا رسانی سے امن ھے اور قتل عام سے بچاؤ ۔ مخالف جماعت کے اسی خوف نے جس نے کارل مارکس کو انقلابی بنایا تھا ، ڈسرائیلی میں حفاظتی نقالی کی شکل اختیار کی ، ایک حیرت انگیز کمال کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو پسندیدہ جماعت میں جذب کر دیا ، ان میں رہ کر عروج حاصل کیا اور آخرکار اس عہد کی مغرور اشرافیت کا رہ نما اور اپنے بادشاہ کا منظور نظر بن گیا ۔ اس کی زندگی کا بنیادی خیال اس فقرے میں موجود ھے جو اس نے اس وقت کہا جب دارالعوام میں لوگوں نے اس کی پہلی تقریر کا تمسخر اڑا کر اسے چپ کرا دیا تھا ۔ ”وہ وقت آئے گا جب تمھیں میری بات سنتے ھی بنے گی“۔ اس کے برعکس طبقۂ امرا کے ایک پیدائشی رکن کا رویہ

اس طرح کے تمسخر کے مقابلے میں کتنا مختلف ہوا کرتا ہے ۔ اس کی توضیح پٹ اکبر کی حکایت سے ہو جائے گی جس نے ایک دفعہ دارالعوام میں اپنی تقریر "شکر جناب!" کے الفاظ سے شروع کی ۔ اس پر لوگ دبی ہنسی ہنسے ۔ چاروں طرف نظر ڈال کر اس نے بلند آواز میں دھرایا ۔ "شکر جناب" دبی ہنسی اب بھی تھی ، تیسری دفعہ تیوری چڑھا کر گرجدار آواز میں اس نے پھر کہا ۔ "شکر جناب" اس دفعہ ہنسی کی ہلکی سی آواز بھی سنائی نہ دی ۔

اچھے اور برے دونوں قسم کے لڑکوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس ندامت کو مٹا سکیں جو انہیں جماعت کے سامنے اٹھانی پڑی ۔ بلندی کے کئی مدارج اس خواہش کے بھی مرہون منت ہیں ۔ حرامی بچوں کے واقعات اس نوع کی مثالوں کی بہترین وضاحت پیش کرتے ہیں ۔ کنگ لیئر (King Lear) کے ڈرامے میں ایڈ منڈ (Edmund) اس طریق کار کی وضاحت کرتا ہے جس طور پر وہ اپنے حرامی ہونے کی وجہ سے رسمی لوگوں کا مخالف بن گیا ہے ۔ میں جرأت سے کہتا ہوں کہ اگر ولیم فاتح کو اپنے نسب کا دھبا مٹانے کی خواہش نہ ہوتی تو وہ ایسے عظیم الشان کارناموں کے سر انجام دینے پر آمادہ نہ ہوتا ۔

اس وقت تک ہم اس اثر پر غور کرتے چلے آئے ہیں جو ایک عام جماعت ان افراد پر ڈالتی ہے جو کردار یا حالات کے اعتبار سے فوق العادۃ ہوں لیکن کئی دفعہ طفلانہ

قسم کے انتہا پسند انبوہ بھی ہوتے ہیں جو ان جماعتوں کے مقابلے میں جن سے ہمیں کم عمری میں واسطہ پڑتا رہا، زیادہ مخرب اخلاق اور زیادہ بے رحم ہوتے ہیں۔ کروپاٹکن (Kropotkin) جوانی میں وردی پوش نوجوان چھوکروں کے کور کا ایک رکن تھا؛ یہ طبقۂ اشراف کا مدرسہ تھا جس میں صرف زار روس کے منظور نظر لڑکے بھیجے جاتے تھے۔ اس نے اس مدرسے کے بارے میں جن تفصیلات کا ذکر کیا ہے، وہ دل چسپی سے خالی نہیں، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"ابتدائی جماعت کے لڑکے جو چاہتے کرتے اور سال گزشتہ کے جاڑے سے زیادہ دور کی بات نہیں کہ ان کا ایک مرغوب مشغلہ یہ تھا کہ چند احمقوں کو رات کے وقت ایک کمرے کے اندر شب خوابی کے لباس میں اکٹھا کر لیتے اور انھیں اس طرح دوڑاتے جیسے گھوڑوں کو سرکس میں دوڑاتے ہیں۔ کور کے کمانڈر اپنے ہاتھوں میں مضبوط ربڑ کے کوڑے لیے کچھ درمیان میں اور کچھ بیرونی طرف کھڑے ہو کر لڑکوں کو بے رحمی سے پیٹتے تھے، حسب معمول یہ سرکس ایشیائی طرز میں نہایت مذموم طریقے پر ختم ہوتا۔ اخلاقیات کا جو تصور اس زمانے میں رائج تھا اور وہ بے ہودہ گفتگو جو مدرسے میں سرکس ختم ہونے کے بعد رات کے واقعات کے متعلق کی جاتی، ان کا ذکر

نہ کرنا ہی بہتر ہے"

مدرسے کے انبوہ کا جو اثر بعض ممتاز ہستیوں کے کردار پر پڑا ہے اس کے بارے میں مبالغہ کرنا مشکل ہے، مثلاً نپولین کو لیجیے، وہ جوانی کے زمانے میں برین (Brienne) کے اشرافی فوجی کالج میں زیر تعلیم تھا جہاں اس کے سوا تقریباً تمام طالب علم بڑے امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے؛ اسے وہاں اس سیاسی رعایت کی بنا پر داخل کیا گیا تھا جو فرانس نے کارسیکا کو عطا کی تھی۔ اس رعایت کی بنا پر کارسیکا کے نوجوانوں کی ایک چھوٹی سی تعداد کو برین کے کالج میں مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ نپولین ایک بہت بڑے کنبے کا فرد تھا اور اس کی ماں غریب تھی۔ جب وہ شاہنشاہ بن گیا تو اس وقت بڑی آسانی سے یہ کھوج لگا لیا گیا کہ گبے لائن (Ghibelline) کے قدیم شاہی خاندان کی نسل سے تھا، لیکن یہ بات اس وقت کسی کو معلوم نہ تھی۔ اس کے کپڑے سادہ اور پھٹے پرانے ہوتے تھے اور دوسرے لڑکے زرق برق لباس پہنتے تھے، وہ بے حیثیت اور نفرت خیز تھا جسے وہ متکبرانہ حقارت سے دیکھتے تھے۔ جب انقلاب رونما ہوا تو اس نے اسے بہ نظر استحسان دیکھا اور یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اسے انقلاب سے جو ہمدردی تھی، اس کا ایک عنصر یہ بھی ہوگا کہ اس کے برین کے رفیق ذلیل کیے جا رہے تھے۔ جب وہ ترقی کر کے شاہنشاہ بنا تو اس کے لیے ایک انتہائی اور الف لیلوی قسم کا انتقام لینا ممکن ہو گیا۔ وہی

آدمی جو اسے حقیر سمجھا کرتے تھے ، انھیں اب مجبور کیا جا سکتا تھا کہ اس کے سامنے جھکنے کی رعایت کے لیے درخواست کریں ۔ کیا اس میں شبہ ہے کہ وہ امارت پرستی جس نے اس کے اقتدار کے آخری سالوں کو بٹا لگایا ، اس کا سرچشمہ تمام وہ ذلتیں تھیں جو اس نے بچپن میں برداشت کی تھیں ؟ اس کی ماں جس نے ذلتیں نہ سہی تھیں ، اس کی ترقی کو ایک خشک بے تعلقی سے دیکھا کرتی اور اس کے خلاف مرضی اپنی تنخواہ کا کافی حصہ ان دنوں کے خوف سے جمع کرتی رہی جب اس کی شان و شوکت کا خاتمہ ہو جاتا تھا ۔

کچھ بڑے لوگ اور زیادہ تر بادشاہ ایسے بھی ہو گزرے ہیں جنھیں انبوہ کے اس دباؤ سے کبھی پالا نہیں پڑا ۔ ان میں سے سب سے زیادہ مشہور سکندر اعظم ہے جو کسی وقت بھی ہم عمروں کے گروہ میں برابری کے ساتھ نہیں رہا ؟ شاید کسی حد تک اس کی عظمت اور اس کی کوتاھیاں دونوں اسی کا نتیجہ تھیں ۔ چنانچہ کسی ایسی شرم نے جو مدرسے کے بچوں کے دلوں میں جاگزیں ہو جاتی ہے ، اسے شاھانہ بلند خیالیوں سے نہیں روکا ۔ اپنے آپ کو فاتح خیال کرتے ہوئے تمام دنیا کی تسخیر اسے فطری معلوم ہوئی ۔ خود کو اپنے تمام ہم عصروں سے بڑا خیال کرتے ہوئے قدرتاً اسے اپنے دیوتا ہونے کا خیال پیدا ہوا ۔ دوستوں سے برتاؤ کرتے وقت جن میں وہ بھی شامل تھے جو اس سے بہت قریب تھے ، اس نے کسی کے حقوق کے اعتراف کا کبھی اظہار نہیں کیا ۔ پرمینیو

(Permanio) اور کلیٹکس (Cletics) کے قتل بذات خود ایک بے رحم جابر کا تصور پیدا کرتے ہیں لیکن نفسیاتی طور پر ان کی توجیہ کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کی بے صبری کا لازمی نتیجہ تھے جسے کبھی بھی انبوہ کے دباؤ کا تجربہ نہیں ہؤا تھا۔

ان مثالوں کے بیان کرنے سے یہ خیال پیدا کرنا مقصود ہے کہ کردار کی تشکیل میں مدرسے کا انبوہ اہم ترین مؤثرات میں سے ایک ہے، بالخصوص جب وہ کسی غیر معمولی قابلیت کے لڑکے کی کسی انفرادی یا معاشرتی خصوصیت کے ساتھ ٹکرائے۔ جو آدمی کوئی مدرسہ کھولتا چاہتا ہے وہ کسی اور عنصر کے مقابلے میں اس بات کو غور سے سوچے کہ وہ کس قسم کے انبوہ کو جنم دے رہا ہے۔ اگر وہ خود ایک رحم دل اور روا دار انسان ہے لیکن مدرسے کے انبوہ کو بے رحم اور تنگ دل بننے کا موقع دیتا ہے تو جو لڑکے اس کی تحویل میں ہوں گے، انھیں باوجود اس کی خوبیوں کے نہایت تکلیف دہ ماحول کا تجربہ ہوگا۔ میرا خیال ہے، بعض جدید مدرسوں میں عدم مداخلت کے نظریے کو اس حد تک اچھالا جاتا ہے کہ وہاں اس قسم کے واقعات آسانی سے ہوسکتے ہیں۔ اگر بچوں کے معاملات میں بالغ لوگ کبھی دخل نہ دیں تو بڑی عمر کے لڑکے، چھوٹی عمر کے لڑکوں پر غالباً جبری اقتدار قائم کر لیں گے اور اس طرح وہ آزادی جو ہر درس گاہ کا نصب العین ہونا چاہیے، جسمانی طور پر مضبوط اشرافوں کا حق بن کر رہ جائے گی۔ بہر حال بڑی

عمر کے لڑکوں کے جبر کو براہ راست انضباطی کاروائیوں سے روکنا بہت دشوار ہے۔ اگر بالغ لوگ بڑی عمر کے لڑکے کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت طاقت کا استعمال کریں گے تو جوابی طور پر بڑی عمر کے لڑکے چھوٹی عمر کے بچوں سے برتاؤ کے معاملے میں قوت سے کام لیں گے ۔ مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ بچوں پر انبوہ کا دباؤ حتی الامکان کم ہو اور جسمانی طاقت کا تفوق اس قدر تھوڑا ہو جس قدر نوخیز انسانی فطرت کے حسب حال ہو۔ اگرچہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اپنے ہم عمروں کے ساتھ سماجی برتاؤ کے متعلق اسباق سیکھنا مفید ہے لیکن یہ چیز ان کے لیے مفید نہیں ہو سکتی کہ ان پر انبوہ کا بہت زیادہ دباؤ ڈالا جائے۔ انبوہ کے دباؤ کے بارے میں دو باتوں سے رائے قائم کی جا سکتی ہے ؛ اول اس کی قوت سے اور دوم اس کے رخ سے۔ اگر یہ بہت شدید ہو تو اس سے ایسے نوجوان پیدا ہوں گے جو سوائے چند شاذ صورتوں کے رسمی اور بزدل انسان ہوں گے۔ بہر حال یہ صورت قابل افسوس ہوگی ، خواہ وہ اخلاق معیار جو انبوہ کو آمادۂ عمل کر رہا ہے ، کتنا ہی قابل تعریف کیوں نہ ہو۔ "ٹام براؤن کے ایام مدرسہ" (Tom Brown's Schooldays) نامی کتاب میں ایک ایسے لڑکے کا ذکر ہے جسے نماز پڑھنے کے جرم میں پیٹا گیا ہے ، اس کتاب نے بڑا اثر پیدا کیا اور میں اپنے معاصرین میں سے ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جسے نماز نہ پڑھنے کے جرم میں مدرسے میں ٹھوکروں سے پیٹا گیا تھا۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ

شخص زندگی بھر ایک زبردست ملحد رہا۔ اس طرح انبوہ کے جبر کی ایسی نیک شکلیں بھی جب اپنی حدود سے بہت آگے نکل جائیں تو ناشائستہ معلوم ہوتی ہیں۔ انبوہ کا حد سے زیادہ دباؤ انسان کی انفرادیت میں مخل ہوتا ہے اور ان تمام دل چسپیوں کی نشو و نما میں بھی حائل ہوتا ہے جو اوسط تندرست لڑکوں میں مشترک نہیں ہؤا کرتیں، مثلاً سائنس، آرٹ، ادب، تاریخ اور ان کے علاوہ ہر وہ چیز جو تمدن میں شامل ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انبوہ کے درمیان جذبۂ رقابت کچھ محاسن بھی رکھتا ہے۔ یہ جذبہ جسمانی طاقت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ہر قسم کی منافقانہ رذالتوں کی حوصلہ فرسائی کرتا ہے، اس لیے اپنی حدود میں اس کے فائدے بھی ہیں۔

یہ فوائد اس صورت میں اور بھی زیادہ ہوتے ہیں جب کہ انبوہ کا منشا مجموعی طور پر نیک ہو، بہ نسبت اس صورت کے جیسا کہ کروپاٹکن نے وردی پوش نوجوان چھوکروں کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ غیر معمولی قابلیت کے لڑکے اور لڑکیوں کے لیے خاص مدرسوں کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ وہاں انبوہ عام مدرسوں کے مقابلے میں زیادہ روشن خیال ہوگا اور مہذب مشاغل سے اسے کم عناد ہوگا، لیکن جہاں صرف عام لڑکے اور لڑکیوں ہی کا معاملہ ہو، وہاں بھی بڑی عمر کے لوگوں کے نمونے سے ایک حد تک برداشت اور رحم دلی اور بڑی حد تک اجتماعی کاموں، مثلاً کھیل وغیرہ میں ایسی دل چسپی پیدا کی جا سکتی ہے، جہاں اجتماعی احساس کا

رخ تعاون کی طرف ہو نہ کہ تشدد کی طرف ۔
بعض غیر معمولی طور پر مضبوط کرداروں کے لیے کسی ایسے معاملے میں جسے وہ حد درجہ اہم خیال کرتے ہوں ، انبوہ کے مقابل صف آرا ہونا تعلیمی زاویۂ نگاہ سے مفید ہوتا ہے ؛ اس عمل سے قوت ارادی مضبوط ہوتی ہے اور انسان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے ، بشرطیکہ زیادہ تکلیف نہ اٹھانی پڑے ، اس سے ہمیشہ فائدہ ہی ہوتا ہے لیکن اگر انبوہ نے اسے ایک خاص حد سے زیادہ آزردہ کر دیا تو وہ یا تو سر تسلیم خم کردے گا اور اس خوبی کو جو اس کے کردار میں سب سے زیادہ بیش قیمت تھی ، ضائع کردے گا ، یا ایسے تخریبی غصے سے آگ بگولا ہو جائے گا جو نپولین کی مثال کی طرح تمام دنیا کو غیر محدود نقصان پہنچائے گا ۔

اس زیادہ بڑے انبوہ کے متعلق جو مدرسے سے باہر واقع ہے ، وہ والدین جن کے خیالات کچھ غیر رواجی سے ہیں ، ایک ایسی الجھن میں پھنس جاتے ہیں جس کے حل کی انھیں کوئی سبیل نظر نہیں آتی ۔ اگر وہ اپنے بچوں کو ایسے مدرسوں میں بھیجیں جہاں غیر معمولی خیالات کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہو ، یا غیر معمولی آزادی کی اجازت ہو تو وہ ڈرتے ہیں کہ جوں ہی لڑکا یا لڑکی وسیع تر دنیا میں قدم رکھیں گے ، وہ خود کو موجودہ حالات کے سانچے میں نہیں ڈھال سکیں گے ۔ جن طلبہ کو جنسیات کے متعلق سوچنے اور گفتگو کرنے کی آزادی حاصل تھی وہ اپنے آپ کو مروجہ خاموشی اور رسمی حیا کے بوجھ کے

نیچے پستا ہؤا پائیں گے - جنھیں حب وطن کی تعلیم نہیں دی گئی تھی انھیں ہماری قومی دنیا میں ایک گوشہ تلاش کرنے میں بھی دقت پیش آئے گی - وہ جن کو آئینی اختیار کی عزت کرنا نہیں سکھایا گیا تھا ، آزادی تنقید کی وجہ سے ہمیشہ تکلیف میں رهیں گے - فی الجملہ جو لوگ آزادی کے عادی ہو چکے ہیں انھیں ان لوگوں کے مقابلے میں جو پیدائشی غلام ہیں ، غلامی کی بیڑیاں زیادہ تکلیف دہ معلوم ہوں گی - کم از کم یہ ہیں وہ دلائل جو میں نے اکثر آزاد منش والدین کی زبانی بچوں کو غیر آزادانہ تعلیم دلانے کے حق میں سنی ہیں -

میرے خیال میں ان دلائل کے دو جواب ہیں ؛ ایک مقابلۃً سطحی اور دوسرا بنیادی - پہلا جواب اس امر کے اظہار پر مشتمل ہے کہ کردار کی ظاہری ہم آہنگی ایک ایسی چیز ہے جسے بچے آسانی سے سیکھ جاتے ہیں اور حقیقتاً یہ ہم آہنگی تعلیم کے تمام ان رواجی نظاموں میں رائج ہے جہاں لڑکوں کا کردار والدین اور اساتذہ کے سامنے اس کردار سے یکسر مختلف ہوتا ہے جو وہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ روا رکھتے ہیں - میرا خیال ہے کہ کردار کی یہ ظاہری ہم آہنگی جس آسانی سے بچپن میں سیکھی جا سکتی ہے اتنی ہی آسانی سے عنفوان شباب میں بھی اخذ کی جا سکتی ہے - کسی حد تک اس کا تعلق فن خوش اخلاق سے ہے ؛ کسی مسلمان کے سامنے محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم) کے خلاف اور ایک مجسٹریٹ کے سامنے تعزیری قوانین کے خلاف زبان کشائی کرنا بد تہذیبی ہوگی -

ممکن ہے مفاد عامہ کے پیش نظر یہ امر ہمارے فرائض میں داخل ہو کہ ہم ان موضوعوں پر کھلم کھلا اپنے خیالات کا اظہار کریں لیکن یہ چیز مشکل ہی سے ہمارے فرائض میں داخل ہو سکتی ہے کہ ہم ایسی بھی صحبتوں میں ان کا اظہار ایسے طریقے پر کریں کہ نتیجہ رنج اور غصے کے سوا کچھ نہ ہو۔ مجھے یقین نہیں کہ آزاد تعلیم کسی لڑکے یا لڑکی کو لازماً خوش اخلاق یا اس ظاہری شائستگی کے سیکھنے کے ناقابل بنا دیتی ہے جو رسمی زندگی کے لیے ضروری ہے، نہ میرا یہ یقین ہے کہ آزاد تعلیم کے بعد ظاہری ہم آہنگی پیدا کرنے کی تکلیف تقریباً اتنی ہی زیادہ ہوگی جتنی ان ذہنی الجھنوں کی وجہ سے ہوگی، جو رسمی تعلیم کے دوران میں جڑ پکڑ لیتی ہیں۔ پہلا جواب اس پر ختم ہوتا ہے۔

دوسرا جواب کچھ زیادہ گہرا ہے۔ ہماری دنیا میں خطرناک برائیاں پائی جاتی ہیں اور اگر انسان ان کا علاج کرنا چاہے تو علاج ممکن ہے۔ جو لوگ ان برائیوں سے آشنا ہیں اور ان کے خلاف لڑتے رہتے ہیں ان کا حصہ غالباً روزمرہ کی مسرتوں میں ان لوگوں کے مقابلے میں کم ہوگا جو حالت موجود پر قانع ہیں، لیکن ان روزمرہ کی مسرتوں کے بدلے میں انہیں وہ چیز ملے گی جسے میں اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے زیادہ بیش قیمت خیال کرتا ہوں۔ انہیں یہ احساس ہوگا کہ دنیا کی تکلیفوں میں کمی کرنے کے لیے انہوں نے مقدور بھر کوشش کی، ان کے یہاں چیزوں کی قدروں کا معیار ان لوگوں کے مقابلے

میں زیادہ منصفانہ ہوگا جو آسانی پسند مقلد ہیں ، انہیں یہ علم ہوگا کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو انسانیت کو جمود اور مایوسی کی گہرائیوں میں ڈوب جانے سے بچاتے ہیں ۔ یہ ایسی چیز ہے جو اس کاہلانہ قناعت سے بہتر ہے اور اگر آزاد تعلیم اسے ترقی دے سکتی ہے تو والدین کو ان شدنی تکالیف سے جی نہیں چرانا چاہیے جو شاید ان کے بچوں کو پیش آئیں ۔

باب ہشتم

تعلیم میں مذہب کا مقام

مذہب ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس کے دو پہلو ہیں: انفرادی اور اجتماعی۔ ابتدائے زمانۂ تاریخ میں مذہب پہلے ہی پرانا ہو چکا تھا، زمانۂ تاریخ کے دوران میں تمدن کے فروغ اور مذہبیت کے زوال کا آپس میں براہ راست تعلق رہا ہے۔ قدیم ترین مذاہب جن کا ہمیں علم ہے، انفرادی ہونے کے بجائے سماجی تھے، ان کے ہاں ایسے طاقت ور دیوتا موجود تھے جو تمام قبیلے کو ایک آدمی کی غلط روی یا راست روی کی بنا پر سزا یا انعام دیتے تھے۔ ان روحوں کی نظروں میں کسی رویے کے قابل تحسین یا قابلِ نفریں ہونے کا اندازہ استقرا سے لگایا جاتا تھا اور مذہبی رہنماؤں کی احادیث میں لکھ دیا جاتا تھا۔ اگر کسی زلزلے یا بیماری کی وجہ سے کسی خاص خطے کے لوگ فنا ہو جاتے تھے تو دانا لوگ کھوج لگاتے کہ ان کی خصوصی عادات کیا تھیں اور فیصلہ کرتے کہ ایسی عادات سے آیندہ احتراز کیا جائے۔ یہ زاویۂ نگاہ تا حال کسی طرح بھی نیست و نابود نہیں ہوا۔ میں کلیسائے انگلستان کے ایک پادری سے واقف ہوں جس کے نزدیک جنگ عظیم میں جرمنوں کی شکست کی وجہ یہ تھی کہ وہ تنقید

کا شوق رکھتے تھے - اس پادری کے عقیدے کے مطابق عبرانی صحائف کی تفسیر خالقِ کائنات کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے -

مذہب ، جیسا کہ اس کے حامی کہنے کے عادی ہیں ، سماجی ذمہ داریوں کے احساس کا منبع ہے - جب کسی آدمی سے ایسا فعل سر زد ہوتا جو دیوتاؤں کی نظروں میں معیوب ہوتا تو وہ نہ صرف مجرم ہی کو بلکہ تمام قبیلے کو بھی سزا دیتے - اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کا فعل ایک نہایت قابلِ توجہ معاملہ بن گیا، کیونکہ نجی گناہ سماجی بلاؤں کے نزول کا باعث ہوا کرتے تھے - یہ نقطۂ نگاہ تا حال قوانینِ فوجداری پر غالب ہے - بعض جنسی بے اعتدالیاں ایسی ہیں جن کے لیے مردوں کو قید کی مصیبت بھگتنا پڑتی ہے - اگرچہ معقولیت پسندانہ زاویۂ نگاہ سے ان کے کردار کا تعلق صرف ان کی ذات سے ہوتا ہے - اگر ایسی سزا کا کوئی جواز تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ " دیکھو میدانی بستیوں کے ساتھ کیا گزری ! " کیونکہ صرف اسی صورت میں ان لوگوں کے اطوار قوم پر اثر انداز ہو سکتے ہیں - یہ عجیب بات ہے کہ جن اعمال کو دیوتا قابلِ اعتراض جانتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ اگر وہ انہیں برافروختہ نہ کرتے تو مشکل ہی سے ان سے کسی کو تکلیف پہنچ سکتی ؛ مثلاً انہیں کسی آدمی کے سؤر یا گائے کا گوشت کھانے یا فوت شدہ بیوی کی بہن سے شادی کرنے پر اعتراض ہے - حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں خدا نے

مردم شماری پر اعتراض کیا ؛ چنانچه وبا سے اتنے آدمی مر گئے
که حضرت داؤد علیه السلام کے اعداد و شمار بالکل نکمے
ھو کر رہ گئے ۔ ازٹک (Aztec) دیوتا اپنے پجاریوں کو
کسی مہربانی کا مستحق سمجھنے سے پہلے انسانی قربانی اور
مردم خوری پر اصرار کرتے تھے ؛ بہر حال اگر چه ہر
مذہب سے پیدا ہونے والے اخلاق ضابطے عجیب و غریب
ھیں ، لیکن یه تسلیم کرنا پڑے گا که مذہب ھی ہے
جس نے ان ضابطوں کو جنم دیا ۔ اگر کسی ضابطۂ اخلاق
کا ھونا نه ھونے سے بہتر ہے تو مذہب ایک ھی نیکی کی
طرف لے جانے والی قوت رہی ہے ۔

اگر چه مذہب کی ابتدا ایک قبائلی معاملے کی حیثیت
سے ھوئی تھی ، لیکن اس نے جلدی ھی خالص انفرادی
پہلو کو بھی نشوونما دی ۔ تقریباً چھٹی صدی قبل مسیح
سے کچھ منتشر سی تحریکیں دنیاے قدیم میں رونما ھونے
لگیں جن کا تعلق انفرادی روح یا اس چیز سے تھا جسے
عیسائی "نجات" کہتے ھیں ۔ چین میں تاؤ کے مذہب ،
ھندوستان میں بدھ مت ، یونان میں اورفیئس (Orphens)
کے دین اور انبیاے یہود کے مذاہب کی یہی کیفیت تھی ؛
ان کی بنا اس عقیدے پر تھی که زندگی غم و اندوہ سے
لبریز ہے اور نیز اس خیال پر که زندگی بسر کرنے کی
کوئی ایسی سبیل سوچنی چاہیے که انسان مصیبتوں سے
بچ سکے ، یا کم از کم انہیں برداشت کر سکے ۔ اس کے
بعد جلد ھی پرمی نائیڈز (Permenides) نے وقت کی
بے حقیقتی اور وحدتِ اشیا کا اصول پیش کر کے فلسفۂ مذہب

کی عظیم روایت کی بنیاد رکھی - یہی شخص افلاطون - پلوٹینس ، فادرس ، سپینوزا ، ہیگل ، برگساں اور باقی تمام متصوف فلسفیوں کا مورث اعلیٰ تھا - انبیائے بنی اسرائیل کے ہاں سے مذہب کی وہ قسم آئی جس کا تعلق ما بعد الطبیعیات کے بجائے نیک کرداری سے تھا ؛ چنانچہ یہی عنصر پروٹسٹنٹ مذہب میں غالب ہے - عیسائیت کی ہر قسم میں دونوں اخلاق اور ما بعد الطبیعیاتی عناصر پائے جاتے ہیں کیونکہ عیسائیت کی ترکیب یہودیت اور یونانیت کی نہایت گہری آمیزش سے ہوئی تھی ، لیکن مجموعی طور پر جوں جوں عیسائیت مغرب کی طرف بڑھتی گئی ، ما بعد الطبیعیاتی عنصر کم اور اخلاق عنصر زیادہ ہوتا گیا - مذہب اسلام میں ایران کو چھوڑ کر ہمیشہ بہت کم ما بعد الطبیعیاتی عنصر رہا ، لیکن جو مذاہب سر زمین ہند سے اٹھے ، وہ زیادہ تر فلسفیانہ تھے -

جب سے انفرادی مذہب نے جنم لیا ہے ، مذہبی زندگی میں ذاتی اور اجتماعی عناصر ہمیشہ ایک دوسرے سے بر سر پیکار رہے ہیں - جماعتی عناصر حسب معمول سیاسی لحاظ سے مضبوط تر رہے ہیں ، کیونکہ مذہبی رہنما ، اوقاف اور روایات ، نیز حکومت اور قانون ان کی پشت پر تھے - ذاتی مذہب ایک نجی معاملہ ہوتا ہے جس کا کسی طرح بھی قوم سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے ، لیکن جماعتی مذہب سیاسی لحاظ سے بڑا اہم ہے - جہاں بھی جماعتی مذہب پایا جاتا ہے ، جائداد اس کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اور ایک آدمی اس کے اصولوں کی تبلیغ سے روزی کما سکتا

ہے ، لیکن مخالفت کر کے نہیں ۔ تعلیم اگر مذہب سے متاثر ہوتی ہے تو صرف جماعتی مذہب سے ہوتی ہے جو تمام قدیم اداروں پر بلکہ بعض ممالک میں تو حکومت پر بھی تسلط جمائے ہوتا ہے ۔ اس وقت مغربی یورپ کے ممالک میں دولت مندوں کی تعلیم میں مذہب کو بالا دستی حاصل ہے ، لیکن غریبوں کی تعلیم پر اس کا اثر کم ہے ، یہ ایک خاص حد تک ایک سیاسی اتفاق ہے ۔ جس ملک میں کوئی مذہب بھی اتنا مضبوط نہ ہو کہ حکومت پر اپنا تسلط قائم رکھ سکے ، وہاں سرکاری مدرسے کسی خاص فرقے کے دینی اصولوں کی تعلیم نہیں دے سکتے ، لیکن جن مدرسوں کا سہارا طالب علموں کی فیسیں ہیں وہ ہر ایسی چیز کی تعلیم دے سکتے ہیں جس کے لیے والدین قیمت ادا کرنا ضروری سمجھیں ۔ زیادہ تر ان حالات کی وجہ سے انگلستان اور فرانس کے امرا غریب شہری باشندوں کے مقابلے میں بہت زیادہ مذہبی ہیں ۔ جب میں کہتا ہوں کہ وہ مذہبی ہیں تو میں اس لفظ کو سیاسی معنوں میں استعمال کرتا ہوں ؛ میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ بڑے نیکوکار ہیں اور نہ لازمی طور پر یہ کہ وہ عیسائی عقائد کو ما بعد الطبیعیاتی طور پر تسلیم کرتے ہیں ، بلکہ صرف یہ کہ وہ کلیسا کے حامی ہیں اور قانونی معاملات میں اس کے حق میں رائے دیتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ایسے لوگوں کی نگرانی میں رہیں جو مذہب کی تعلیم کے قائل ہوں ۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک کلیسا کو اہمیت حاصل ہے ۔

آزاد منش عوام میں اکثر کی رائے یہ ہے کہ کلیسا قومی زندگی میں ایک وزنی عنصر کی حیثیت سے ختم ہو چکا ہے ، میرے خیال میں یہ شدید غلطی ہے ۔ نکاح و طلاق کے قوانین اگرچہ بالکل ویسے تو نہیں جیسے اہل کلیسا چاہتے ہیں لیکن پھر بھی ان میں تا حال بیہودگیاں اور بے انصافیاں پائی جاتی ہیں ؛ مثلاً دیوانگی کی حالت میں طلاق کی اجازت نہ دینا وغیرہ ۔ اگر مختلف عیسائی کلیساؤں کا اثر حائل نہ ہوتا تو یہ چیزیں ایک ہفتہ بھی زندہ نہ رہ سکتیں ۔ عیسائیت کے صریح مخالفین کو ان لوگوں کے مقابلے میں جو زیادہ پرہیزگار اور زیادہ محتاط ہیں ، کئی لحاظ سے رکاوٹیں پیش آتی ہیں ۔ عملی طور پر کئی عہدے کھلم کھلا ملحدوں کو نہیں مل سکتے اور انہیں کامیاب ہونے کے لیے متعصب مذہبی لوگوں کی نسبت زیادہ قابلیت درکار ہے ۔

عہدِ حاضر میں بمقابلہ دیگر امور کے تعلیم میں اجتماعی مذہب کو زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ انگلستان میں تمام پبلک سکول نیز تقریباً تمام ابتدائی مدارس یا تو کلیسائے انگلستان سے تعلق رکھتے ہیں یا رومن کیتھولک فرقے سے ۔ بعض اوقات آزاد خیال والدین جو اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجتے ہیں ، یہ کہتے ہیں کہ چونکہ اکثر لوگ اس تعلیم کے خلاف ردِ عمل محسوس کرتے ہیں ، اس لیے کچھ حرج نہ ہوگا اگر بچوں کو باطل کی تعلیم دی جائے تا کہ جب ان میں ردِ عمل پیدا ہو تو ممکن ہے وہ حق کے معتقد ہو جائیں ۔ یہ دلیل اس بزدلانہ اہمیت

کے حق میں محض ایک بہانہ ہے ، جسے تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد اعداد و شمار سے غلط ثابت کیا جا سکتا ہے ۔ بالغوں کی ایک بہت بڑی اکثریت ان چیزوں کو عمر بھر درست سمجھتی رہتی ہے جو انہیں بچپن میں سکھائی گئی تھیں ۔

مختلف ملک پروٹسٹنٹ ، کیتھولک ، مسلمان یا جو کچھ وہ ہیں ، صدیوں سے یوں ہی چلے آ رہے ہیں ، لیکن اگر رد عمل کا نظریہ درست ہوتا تو وہ ہر نسل کے بعد اپنا مذہب بدل لیا کرتے ۔ خود وہ لوگ جو اپنے بچوں کو راسخ الاعتقادی کی تعلیم دلانے کے متعلق یہ دلیل پیش کرتے ہیں ، ان کا طرز عمل اس چیز کا ثبوت ہے کہ خود ان میں کس قدر کم ردعمل پیدا ہوا ہے ۔ اگر ذاتی طور پر آپ کا اعتقاد یہ ہو کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں لیکن آپ اس رائے کے کھلم کھلا اظہار سے احتراز کریں اور پھر اس بات کو جائز سمجھیں کہ قومی روپیہ آپ کے بچوں اور دوسرے لوگوں کے بچوں کو یہ سکھانے پر صرف کیا جائے کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں تو سماجی لحاظ سے آپ کی مؤثر رائے یہ ہوگی کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں اور آپ کی ذاتی رائے جو اس کے بر عکس ہے ، غیر اہم ہو جائے گی ۔ پس وہ لوگ جو خود پابند مذہب نہیں ہیں اور مذہبی تعلیم کو مفید خیال کرتے ہیں ، خود انھوں نے اپنی مذہبی تعلیم کے خلاف ، خواہ وہ ہمہ تن احتجاج ہی کیوں نہ ہوں ، مؤثر طور پر ردِ عمل کا ثبوت نہیں دیا ۔

بہت سے لوگوں کا جو عقلی طور پر عقائدِ مذہب کی تائید نہیں کرتے، یہ خیال ہے کہ مذہب بہر حال ایک بے ضرر اور شاید مفید چیز بھی ہے۔ میں اس معاملے میں آزاد خیالوں کے مقابلے میں اُن تقلید پرستوں کا ہم نوا ہوں جنہیں آزاد خیالی کا مخالف کہنا چاہیے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے سوالات کہ آیا خدا ہے؟ یا آیا موت کے بعد بھی ہم باقی رہیں گے؟ اہم سوال ہیں اور اِن معاملات میں جس قدر صداقت سے غور کرنا ممکن ہو، اُتنا ہی اچھا ہے۔ میں سیاست پیشہ لوگوں کے اس خیال کو قبول نہیں کر سکتا کہ اگر خدا نہ بھی ہو، جب بھی مناسب یہی ہے کہ اکثر لوگ خدا کے وجود کے معتقد رہیں کیوں کہ یہ خیال انسان کو نیکوکاری پر ابھارتا ہے۔ بچوں کے بارے میں بہت سے آزاد خیال یہی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر تم بچوں کو مذہبی تعلیم نہ دو گے تو انہیں نیک کیسے بنا سکو گے؟ میں جواب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک اہم ترین مسئلے کے متعلق عادتاً اور دانستہ جھوٹ بول کر تم انہیں نیکی کی تعلیم کیسے دے سکتے ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس طرز عمل کے لیے جو حقیقتاً قابلِ ستائش ہو، ایک جھوٹے عقیدے کو بطور محرک استعمال کیا جائے؟ جس چیز کو آپ اچھے کردار کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اگر اس کے لیے کوئی سچے دلائل نہیں تو لازمی طور پر اس کے متعلق تصور میں ضرور کوئی نقص ہوگا؟ بہر حال بچوں کے طور طریقوں پر اثر

ڈالنے والی چیز مذہب کی بجائے پدرانہ تحکّم ہے۔ مذہب زیادہ تر صرف اتنا کرتا ہے کہ ان میں ایسے جذبات پیدا کرتا ہے جن کا عمل سے قریبی تعلق نہیں ہوتا اور جو بہت حد تک زیادہ پسندیدہ بھی نہیں ہوتے۔ بلاشبہ یہ جذبات بالواسطہ طور طریقوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، اگرچہ یہ اثرات ایسے بالکل نہیں ہوتے جن کی طلب کا دعویٰ مذہبی معلمین کرتے ہیں؛ بہر حال یہ ایسا موضوع ہے جس کی طرف پھر رجوع کروں گا۔

مذہبی تعلیم کے مضر اثرات کا مدار کچھ تو ان عقائد پر ہے جن کی تعلیم دی جاتی ہے اور کچھ اس اصرار پر کہ بعض مشتبہ مسائل کا درست ہونا معلوم ہو چکا ہے۔ ممکن ہے یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ آیا یہ مسائل حقیقةً درست بھی ہیں یا نہیں، لیکن مذہبی معلمین کی یہ کوشش کہ بچے خواہ مخواہ ان مسائل کو درست سمجھنے لگیں، جھوٹ کی تعلیم دینے کے مترادف ہے، کیوں کہ خواہ حقیقةً درست ہوں یا غلط لیکن زیر بحث مسائل حتمی طور پر یقینی نہیں ہیں؛ مثلاً حیات بعدالممات ہی کو لیجیے؛ اس معاملے میں دانش مند لوگ اپنی لاعلمی کے قائل ہیں۔ شہادت ناکافی ہے، اس لیے بہترین صورت یہی ہو سکتی ہے کہ فیصلے کو معلق رکھا جائے۔ لیکن عیسائیت نے حیات بعد الممات کے حق میں فیصلہ دے رکھا ہے، اس لیے جو بچے اس کے زیر اثر تربیت پاتے ہیں انہیں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ حیات بعدالممات یقینی ہے۔ ایک قاری کہہ سکتا ہے کہ اس میں کیا حرج ہے کیوں کہ یہ

اعتقاد سکون بخش اور غیر ضرر رساں ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ یہ عقیدہ مندرجہ ذیل طریقوں پر نقصان دہ ہے ۔

اول: اگر ایک معمولی فراست کا طالب علم سوچ بچار کے بعد محسوس کرتا ہے کہ حیات بعدالممات کے ثبوت میں دلائل غیر قطعی ہیں تو اس کے استاد اسے بد دل کریں گے بلکہ ممکن ہے سزا بھی دے دیں ۔ جن دوسرے لڑکوں میں اس طرح سوچنے کا رجحان پایا جائے گا انہیں بھی اس موضوع پر گفتگو کرنے سے بد دل کیا جائے گا ، بلکہ اگر ممکن ہوا تو انہیں ایسی کتابوں کے مطالعے سے بھی روکا جائے گا جن سے ان کی قوتِ استدلال اور علم میں اضافہ ہو سکتا ہو ۔

دوم: چونکہ بہت سے ایسے لوگ جن کی سوجھ بوجھ اوسط لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ہے ، آج کل کھلم کھلا یا چوری چھپے ”لاادری“ بن رہے ہیں لہذا ایسے مدرسے کے استاد جو مذہب پر زور دیتے ہیں ، یا بدھو ہوں گے یا منافق ، جو سوائے اس صورت کے کہ وہ اس چھوٹی سی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں جو جوہرِ قابلیت رکھنے کے باوجود کسی دماغی وہم کی بنا پر دانش مندانہ فیصلے کے قابل نہیں ہوتی ۔ عملی طور پر یوں ہوتا ہے کہ جو لوگ تعلیمی پیشہ اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ اوائلِ عمر ہی سے اپنے دل و دماغ میں جرأت آموز خیالات پیدا ہی نہیں ہونے دیتے ، وہ بزدل اور رسمی انسان بن جاتے ہیں ۔ اول اول مذہبی معاملات میں اور پھر قدرتی

اثر پذیری کی وجہ سے دوسرے تمام معاملات میں بھی اس لومڑی کی طرح جس کی دم کٹ گئی تھی ، وہ اپنے شاگردوں سے کہتے ہیں کہ بزدل اور رسمی ہونا بہتر ہے ۔ جب وہ کافی عرصے تک کام کر چکتے ہیں تو اربابِ اختیار کو ان کی خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں اور انہیں با اقتدار مناصب پر ترقی دے دی جاتی ہے ۔ پس وہ لوگ جو بہ حیثیت استاد اپنی اسامی کو قائم رکھ سکتے ہیں اور زندگی کو کامیاب بنا سکتے ہیں ، ان کا تقرر زیادہ تر مذھبی یا اسی طرح کی دوسری آزمائشوں کی بنا پر کیا جاتا ہے ، جو صریحی یا غیر صریحی طور پر اساتذہ کے انتخاب کو محدود کر دیتی ہیں اور بہت سے ایسے لوگوں کو جو نوجوانوں کو ذھنی اور اخلاق طور پر ابھارنے کی بہترین اھلیت رکھتے ہیں ، اس پیشے میں شامل ہونے سے روک دیتی ہیں ۔

سوم : جب تک بعض مسائل کو مقدس اور اعتراضات سے بالا سمجھا جاتا رہے گا ، بچوں میں سائنسی روح پھونکنا ممکن نہ ہوگا ۔ سائنسی رویے کا خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کو ہم تسلیم کرنا چاھیں اس کے لیے ھمارے پاس شواھد ہوں اور سائنسی رویہ اس امر کا لحاظ رکھے بغیر کہ شواھد کس طرف لیے جا رہے ہیں ، ان کی پیروی کرتا ہے ۔ جب ہم کسی مذھب کی بقا چاھتے ہیں تو اسے چاروں طرف سے جذبات اور ممنوعات سے گھیر لینا ضروری سمجھا جاتا ہے اور اسی طرح تھرائی ہوئی آواز میں جو مردانہ سوزوگداز سے لبریز ہوتی ہے ، یہ کہتے

ہیں کہ اس مذہب میں بڑی بڑی صداقتیں پوشیدہ ہیں اور سچائی کی جانچ پڑتال کے لیے غیر سائنسی معیار قائم کرتے ہیں ؛ خصوصیت سے دل کے احساسات اور نیک لوگوں کے ایقان و اخلاق کا ذکر کرتے ہیں ۔ مذہب کے عروج کے ایام میں جب لوگ ٹامس اکناس (Thomas Aquinas) کی طرح یہ ایمان رکھتے تھے کہ خالص عقل عیسائیت کے بنیادی عقائد کی سچائی ثابت کر سکتی ہے ، اس وقت جذبات غیر ضروری تھے ؛ چنانچہ سینٹ ٹامس کی کتاب سوما (Summa) ڈیوڈ ہیوم (David Hume) ہی کی طرح پرسکون اور مدلل ہے لیکن اب وہ دن گزر چکے ہیں ۔ عہد حاضر کا معلم دینیات ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو جذبات سے لبریز ہوتے ہیں تاکہ قارئین کے دلوں میں ایک ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ دلائل کی منطقیانہ معقولیت کی جانچ پڑتال غور سے نہ کی جا سکے ۔ جذبات اور قلبی تاثرات کی بیجا مداخلت ہمیشہ معاملے کے مخدوش ہونے کی علامت ہوتی ہے ، مثلاً ذرا مذہب کے مدافعتی حامیوں کے طریق کار کو اس مسئلے پر آزما کر دیکھیے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں ، نتیجہ کچھ اسی قسم کا ہوگا :

''ایک کارو باری آدمی جو دفتر میں مصروف کار ہے ، ایک سیاسی مدبر جو قومی آمدنی کا تخمینہ لگا رہا ہے ، ریل کے ٹکٹ بیچنے والا ایک کارک جو لوگوں کے نام نہاد پُرهجوم اوقات سے عہدہ برا ہونے کی کوشش کرتا ہے ، ایک معصوم بچہ جو ننھے بھائی کے لیے شکر کی گولیاں خرید رہا ہے اور ایک غریب اسکیمو جو بحر منجمد شمالی کے

کنارے کھڑا اپنا حقیر مچھلیوں کا شکار کر رہا ہے، یہ سب لوگ اس عظیم الشان حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ کیا اس حقیقت کا اتنا وسیع اعتراف ایک گہری روحانی ضرورت کے انسانی اقدار کے بغیر ہو سکتا ہے؟ کیا ہم ایک تمسخر اڑانے والے متشکک کی باتوں پر کان دھریں جو ہمیں عقل و خرد کے اس روشن ورثے سے محروم کرنا چاہتا ہے جو ہمیں اس زمانے نے عطا کیا تھا، جو ہمارے اِس زمانے کی به نسبت جو محض فلمی اور بے معنی گانوں میں مصروف ہے، ہستیِ لا محدود سے زیادہ قریب تھا؟ نہیں ہزار بار نہیں"۔ لیکن یہ امر مشکوک ہے کہ آیا لڑکے ریاضی کو اس طریق سے مروجہ طریقوں کی نسبت زیادہ اچھی طرح سیکھ سکیں گے۔

ان دلائل کی بنا پر جن پر ہم بحث کرتے آئے ہیں، ہر عقیدے کی تعلیم خواہ وہ کچھ ہی ہو، جب اسے ان عقلی معیاروں کے مطابق جن پر ہم اپنے باقی سائنسی عقائد کو پرکھتے ہیں، جانچنے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے تو اغلباً یہ تعلیم کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔ بہرحال اس مذہبی تعلیم پر جو آج کل تمام عیسائی ممالک میں بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو دی جا رہی ہے، کئی خاص اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ مذہب ایک محدود الخیال طاقت ہے اور اس میں ابھی تک وہ بہت سی برائیاں باقی ہیں جو گزشتہ زمانے میں پائی جاتی تھیں۔ اہلِ روم دوسری کو تھیجی لڑائی تک دیوتاؤں کے حضور میں انسانوں کی

قربانیاں پیش کرتے تھے ؛ اگر مذہب نہ ہوتا تو وہ ایسی وحشیانہ حرکت کا ارتکاب ہرگز نہ کرتے ؛ اسی طرح خود ہمارے زمانے میں لوگ مذہبی تحریک سے بعض ایسے کام کرتے ہیں جو اگر مذہب نہ ہوتا تو ناقابل برداشت طور پر ناانصافی پر مبنی نظر آتے ۔ رومن کیتھولک کلیسا تا حال جہنم کا قائل ہے ۔ کلیسائے انگلستان پریوی کونسل کے غیر مذہبی ممبروں کے اس فیصلے کے مطابق جو کنٹربری اور یارک کے لاٹ پادریوں کی مخالفت کے باوجود صادر کیا گیا تھا ، جہنم کو جزو مذہب نہیں قرار دیتا ، لیکن پھر بھی انگلستان کے اکثر پادری تا حال جہنم کے قائل ہیں ۔ تمام وہ لوگ جو جہنم کے وجود کو مانتے ہیں ، انتظامی سزا کو یقینی طور پر جائز قرار دیتے ہیں اس لیے ان کے پاس اس چیز کا نظری جواز موجود ہے کہ تعلیم میں اور مجرموں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں ظالمانہ طریقے اختیار کیے جائیں ۔ مذہبی رہنماؤں کی ایک بہت بڑی تعداد ہمیشہ جنگ چھڑ جانے پر اس کی تائید کیا کرتی ہے ، اگرچہ امن کے زمانے میں وہ اکثر صلح پسند ہوتے ہیں ۔ لڑائی کی حمایت کرتے وقت وہ بڑے زور شور سے اس عقیدے کا اظہار کرتے ہیں کہ خدا ان کے ساتھ ہے اور ان لوگوں کی ایذ ارسانی کے لیے مذہبی تائید پیش کرتے ہیں جو قتل عام کو غیر دانش مندانہ فعل سمجھتے ہیں ۔ جب تک غلامی باقی رہی ، اس کی تائید میں مذہبی دلائل ڈھونڈ لیے گئے ۔ عہد حاضر میں اسی طرح کے دلائل سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کے حق میں پیش کیے جا

رہے ہیں، تقریباً ہر قسم کی روایتی بے انصافیوں اور مظالم کو منظم مذہب کی تائید حاصل رہی ہے، حتیٰ کہ قوم کے غیر مذہبی لوگوں کے اخلاقی احساس نے اسے محاذ بدلنے پر مجبور کر دیا۔

دوم: عیسائیت صرف انھی لوگوں کے لیے باعثِ تسکین ہو سکتی ہے جو اس پر ایمان لاتے ہیں، لیکن جب اعتقاد کمزور پڑ جاتا ہے تو اس روحانی تسکین کو چھوڑ دینا تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔ خدا اور حیات بعد الممات پر اعتقاد رکھنے سے انسان متشککین کے مقابلے میں کم تر روایتی جرأت سے زندگی گزارنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ بہت سے نوجوان ان اعتقادات کو زندگی کی اس منزل پر کھو دیتے ہیں جب نا امیدی سہل ہوتی ہے اور اسی طرح انھیں اُن لوگوں کے مقابلے میں جن کی تربیت مذہبی طور پر نہیں ہوئی تھی، بہت زیادہ تلخیوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ عیسائیت موت یا دنیا سے نہ ڈرنے کے متعلق دلائل پیش کرتی ہے لیکن ایسا کرنے میں وہ مناسب طور پر جرأت کی تعلیم دینے میں نا کام رہتی ہے۔ چونکہ مذہب کی خواہش زیادہ تر خوف کا نتیجہ ہے اس لیے مذہب کے حامیوں کا رجحانِ طبع یہ ہے کہ خوف کی بعض قسموں کو ناپسندیدہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ میرے خیال میں وہ اس معاملے میں سخت غلطی پر ہیں کیونکہ خوف سے بچنے کے لیے بعض پسندیدہ عقائد سے دل بہلانا زندگی گزارنے کا کوئی عمدہ طریقہ نہیں۔ جس حد تک مذہب جذبۂ خوف کو اپیل کرتا ہے اسی

حد تک انسانی وقار کو کم کر دیتا ہے -

سوم : اگر ہم مذہب پر سنجیدگی سے غور کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم کو دوسری دنیا کے مقابلے میں یہ دنیا غیر اہم نظر آنے لگے گی اور اس طرح اپنے اعمال و افعال کو جنم ملے گا جو اس دنیوی زندگی میں مصائب کا پلڑا اس لیے بھاری کر دیں گے کہ جنت میں خوشی میسر ہو - اس زاویۂ نگاہ کی وضاحت کے لیے جنسیات کا مسئلہ ایک بڑی مثال ہے جس پر میں اگلے باب میں بحث کروں گا - بلا شبہ جو لوگ صدق اور خلوصِ دل سے عیسائیت کے قائل ہیں وہ افلاس اور بیماری جیسی برائیوں کو اس خیال سے کم کر کے پیش کرنے کا میلان رکھتے ہیں کہ ان کا تعلق صرف دنیاوی زندگی سے ہے - یہ نظریہ بڑی سہولت سے سرمایہ داروں کے نقطۂ خیال کی تائید کرتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اکثر چوٹی کے سرمایہ دار تہِ دل سے مذہبی ہوتے ہیں - اگر کوئی آئندہ زندگی بھی ہے اور اگر بہشت دنیا کی تکلیفوں کا انعام ہے تو پھر صحیح طریق یہی ہے کہ ارضی زندگی کی اصلاح میں رکاوٹ ڈالی جائے اور ہمیں صنعت و حرفت کے ان ناخداؤں کی بے غرضی کی داد دینا چاہیے جو دوسروں کو اس دنیا کی سودمند اور ناپائدار تکالیف کے اجارے کی اجازت دے دیتے ہیں ؛ لیکن اگر حیات بعدالممات کا اعتقاد غلط ہے تو اس صورت میں ہم اصل کو چھوڑ کر ظل چھاؤں کے پیچھے پڑے ہیں اور ہماری مثال ان بد بختوں کی سی ہے جو زندگی بھر کا اندوختہ ایسے کاروبار کی نذر کر دیتے

ھیں جہاں ان کا دیوالہ نکل جاتا ہے۔

چہارم: اخلاق پر مذہبی تعلیم کے اثرات کئی لحاظ سے برے ھیں۔ یہ جذبۂ خود اعتمادی کے سوتوں کو خشک کر دیتے ھیں۔۔بالخصوص جب یہ اقرارِ گناہ والی قسم کے ہوں کیوں کہ اس طرح نوجوانوں کو سند کا سہارا لینا سکھایا جاتا ہے اور ان میں اکثر خود آموزی کی اہلیت ھی نہیں رہتی۔ میں کئی ایسے اشخاص کو جانتا ہوں جن کی تربیت بہ حیثیت رومن کیتھولک کے کی گئی تھی لیکن جب ان کا اعتقاد جاتا رہا تو ان کے طور طریقے ایسے ہو گئے جنھیں افسوس ناک کہنا چاہیے۔ بعض لوگ کہیں گے کہ ایسے لوگ مذہب کی اخلاق افادیت کا ثبوت ھیں لیکن میری رائے اس کے بالکل الٹ ہے، کیوں کہ قوتِ ارادی کی کمزوری جس کا اظہار انھوں نے کیا، براہِ راست ان کی تعلیم کا نتیجہ ہے؛ اس کے علاوہ جب صرف مذہب ھی کو اخلاق کی انتہائی بنیاد کے طور پر پیش کیا جائے تو جو انسان مذہب کا منکر ہو جاتا ہے وہ اغلباً اخلاق کا بھی منکر ہو جائے گا۔ سیموئل بٹلر (Samuel Butler) کی کتاب[1] کے ہیرو نے جوں ھی عیسائیت کو چھوڑا اپنی نوکرانی سے زنا بالجبر کا ارتکاب کیا۔ نوکرانی سے زنا بالجبر نہ کرنے کی کئی معقول وجوہ موجود ھیں لیکن نوجوان مذکور کو ان میں سے کوئی بھی نہیں بتائی گئی تھی؛ اسے صرف یہی سکھایا گیا تھا کہ

1. The Way of All Flesh.

ایسے اعمال خدا کو نا پسند ہیں ۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ ہمارے زمانے میں اعتقاد کا فقدان ایک عام واقعہ ہے ، اس لیے تمام اخلاق بلکہ اس کے کم از کم ناگزیر حصے کی تعمیر ایسی بنیاد پر کرنا جس کے گر جانے کا اس قدر احتمال ہو ، کوتاہ اندیشی ہے ۔

مذہبی تعلیم کا ایک اور اخلاقی طور پر نا پسندیدہ پہلو یہ ہے کہ وہ ذہنی اوصاف کی قدر و قیمت کا ناکافی اندازہ لگاتی ہے ۔ یہ ذہنی نا طرف داری کو جو ایک نہایت ہی اہم وصف ہے ، حتمی طور پر برا خیال کرتی ہے اور مشکل معاملات کو سمجھنے کی پیہم کوشش کو زیادہ سے زیادہ قابلِ برداشت خیال کرتی ہے ۔ جن لوگوں کو وہ اس وقت بطور نمونہ پیش کرتی ہے وہ اکثر اعلیٰ دماغ کے انسان نہیں ہوتے اور اگر کبھی ہوں بھی تو اس کی وجہ وہ بے وقوفی کی بات ہوتی ہے ، جو کسی کمزوری کے موقع پر ان کے منہ سے نکل جاتی ہے ۔ چونکہ مذہب اور نیکی کو مترادف سمجھا جاتا ہے ، نیز اس لیے کہ اکثر مذہبی آدمی بہت زیادہ سمجھ دار نہیں ہوتے ، مذہبی تعلیم احمقوں کو پڑھے لکھے لوگوں کے اقتدار کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ دلاتی ہے ۔ مثلاً جیسا کہ اُن مقامات پر ہوا جہاں نظریۂ ارتقا کی تعلیم کو خلافِ قانون قرار دیا گیا ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انجیل میں ایک لفظ بھی عقل و خرد کی تعریف میں موجود نہیں ، بالخصوص اس معاملے میں مذہبی رہنما دوسرے معاملات کے مقابلے میں انجیل کے احکام کی زیادہ

تن دہی سے پیروی کرتے ہیں ؛ چنانچہ عیسائی مذہبی اداروں میں جو اخلاقیات پڑھائی جاتی ہیں ، ان کا یہ پہلو حد درجہ ناقص ہے ۔

عیسائی علمِ اخلاق میں اساسی نقص یہ ہے کہ وہ بعض ایسے اسباب کی بنا پر ، جن کا معاشری نتائج سے کچھ سر و کار نہیں ، بعض افعال پر گناہ اور بعض پر نیکی کی مہر لگا دیتا ہے ۔ ایسے علم اخلاق کو جس کی بنیاد توہمات پر نہ ہو ، پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ کون سے سماجی اثرات ہیں جنھیں پیدا کرنے یا جن سے بچنے کا وہ خواہش مند ہے ؛ اس کے بعد اسے جہاں تک علم اجازت دے ، فیصلہ کرنا چاہیے کہ کون سے اعمال ایسے ہیں جن سے مطلوبہ اثرات کو ترقی ملے گی ۔ چنانچہ وہ ایسے اعمال کو سراہے گا اور ان کے برعکس میلان رکھنے والے اعمال کی مذمت کرے گا ۔ زمانۂ قدیم کے اخلاق کی یہ صورت نہیں ، وہ انسانی کردار کے بعض طور طریقوں کو ایسی وجوہ کی بنا پر ، جو انسانیت کی تاریکیوں میں گم ہو چکی ہیں ، معیوب قرار دیتا ہے ۔ مجموعی طور پر کامیاب قوموں میں قابلِ سرزنش اعمال کا رجحان ضرر رسانی اور قابلِ ستائش افعال کا رجحان فائدہ رسانی کی طرف ہوتا ہے لیکن تمام جزئیات کی یہ کیفیت نہیں ؛ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ در اصل جانوروں کو مذہبی وجوہ کی بنا پر نہ کہ ان کی افادی حیثیت کے پیش نظر گھروں میں پالا گیا تھا ۔ جن قبیلوں نے مگر مچھوں اور شیروں

کو سدھانا چاھا ، وہ نیست و نابود ھو گئے لیکن جنھوں نے بھیڑوں اور گایوں کا انتخاب کیا وہ پھلے پھولے!
اسی طرح جب ایسے قبائل جن کے اخلاق ضابطے ایک دوسرے سے مختلف تھے ، باھم ٹکرائے تو انھی قبائل کی کامیابی کی توقع کی جا سکتی تھی جن کا ضابطۂ اخلاق کم سے کم لغو تھا ، لیکن کوئی ضابطۂ اخلاق بھی جس کی بنیاد توھمات پر ھو ، لغویات کی آمیزش سے آزاد نہیں ھو سکتا ۔ ایسی بے ھودگیاں عیسائی ضابطۂ اخلاق میں موجود ھیں ، گو پہلے کی نسبت کم ۔ اتوار کے دن کام کاج کرنے کی ممانعت کی عقلی طور پر حمایت کی جا سکتی ھے لیکن کھیل کود اور تفریح کی ممانعت کی نہیں! چوری کی ممانعت بالعموم درست ھے لیکن اس طرح نہیں جس طرح اس کا اطلاق جرمنی کے کلیساؤں نے کیا تھا تاکہ جلاوطن شاھزادوں کی جائداد پر قومی قبضہ رک جائے ۔ جنسیات کے معاملے میں عیسائی اخلاق کی توھماتی نوعیت از بس نمایاں ھے لیکن یہ موضوع اتنا وسیع ھے کہ اس کے لیے ایک علیحدہ باب کی ضرورت ھے ۔

باب نہم

تعلیم میں جنسیات کا مقام

جنسی اخلاق کے بارے میں مہذب بالغوں کی اپنی جو رائے ہوتی ہے وہ عام طور پر اُس سے چنداں مختلف ہوتی ہے جو وہ اپنے بچوں کو سکھانا چاہتے ہیں۔ اخلاق کا ایک روایتی ضابطہ ایسا ہے جسے انسانی آبادی کا ایک حصہ اب بھی پورے خلوص سے مانتا ہے لیکن باقی لوگ اسے برائے نام اور شریف کہلانے کے لیے تسلیم کرتے ہیں۔ عام طور پر جن لوگوں کی رائے جنسیات کے بارے میں روایتی ہے وہ اُن لوگوں کے مقابلے میں جو روایاتی ضابطۂ اخلاق کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اپنے نظریات کی اشاعت اور تبلیغ زیادہ وثوق سے کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے اور اپنے احباب کے کردار کے بارے میں زیادہ وسیع المشرب بننے کے لیے تیار ہوتے ہیں، انھیں مشکل ہی سے اس بات کا واضح تصور ہوتا ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق ہے کیا ؟ اور وہ اس امر کے لیے شاذ ہی رضامند ہوتے ہیں کہ روایتی ضابطے سے اپنے اختلاف کو کھلم کھلا ظاہر کریں ؟ مزید برآں وہ کچھ یوں محسوس کرتے ہیں کہ جو ضابطۂ اخلاق بھی وہ مقرر کریں گے، جنسی جذبات یقینی طور پر

مردوں اور عورتوں کو اس کے خلاف عمل کرنے پر مجبور کر دیں گے اور یہ کہ جب عقیدے کی شدت اس سے زیادہ ہو، جتنی کہ پاسِ صداقت کا تقاضا ہے تو یقینی طور پر عمل کی دنیا میں درست حد تک آزادی از خود حاصل ہو جائے گی۔ جس آدمی کا عقیدہ یہ ہو کہ شادی کے سوا کسی حالت میں بھی مباشرت جائز نہیں، ممکن ہے وہ بھی شدتِ محبت کی وجہ سے یوں محسوس کرنے لگے کہ اس خاص صورت میں حالات ایسے غیر معمولی ہیں کہ ضابطۂ اخلاق میں نرمی کی اجازت ہونی چاہیے۔ جس انسان کا خیال یہ ہو کہ شدتِ محبت کی وجہ سے انسان شادی کے سوا بھی جنسی تعلقات رکھ سکنے کا مجاز ہے، وہ ہنگامی ترنگ کو شدید محبت کہنے لگے گا۔ پس جو شخص یہ سمجھے کہ ہنگامی ترنگیں بھی جائز ہیں، بشرطیکہ وہ طرفین کی ہوں اور روپے پیسے کے لالچ کو ان میں دخل نہ ہو، ایسا ممکن ہے کہ طرفین کی رضامندی کی شرط کو بھول جائے اور خفیہ طور پر اس کی جگہ روپے پیسے کے لالچ کو بھی شامل کر لے۔ اس طریقے سے اکثر لوگ عقیدے کے مقابلے میں اپنے عمل میں زیادہ آزادی پیدا کر لینے کا میلان رکھتے ہیں، اس لیے جنسیات کے بارے میں کسی قسم کی آزادی کی حمایت کرنے سے پہلے یہ ہمیشہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ جس آزادی کو اختیار کیا جائے گا وہ عموماً اس سے زیادہ ہوگی جس کی وکالت کی جا رہی ہے۔

بالغوں کے صحیح جنسی اخلاق کے بارے میں خواہ کچھ رائے بھی قائم کی جائے، مگر بچوں کی جنسی تعلیم کے بارے میں بھی کچھ سوالات ایسے ہیں جن پر عقل عمومی اور نفسیات کے پہلو سے بنیادی تنقیحات اٹھائے بغیر غور کیا جا سکتا ہے۔ رواج یہ ہے کہ تعلیم اُن لوگوں کے سپرد کی جاتی ہے جو خصوصیت سے جاہل، متعصب اور تنگ نظر ہوتے ہیں۔ آسودہ حال لوگوں کے بچے بچپن میں زیادہ تر اناؤں کے ہاتھ میں چھوڑ دیے جاتے ہیں جو عام طور پر کنواری اور بے جا طور پر محتاط ہوتی ہیں۔ جب بعد میں وہ زیادہ تعلیم یافتہ عورتوں کی تحویل میں دیے جاتے ہیں تو وہ عورتیں بھی عام طور پر کنواری ہوتی ہیں اور توقع یہ کی جاتی ہے کہ وہ نہایت ہی معصوم چال چلن کی ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عام طور پر بزدل، جذباتی اور حقیقت کا سامنا کرنے سے خائف ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ان کی رائے جنسیات کے بارے میں ضدی قسم کی اور غلط ہوگی۔ مدرسوں کے اساتذہ گو لازماً غیر شادی شدہ نہیں ہوتے لیکن ان سے ایک اونچے اخلاقی رویے کی امید کی جاتی ہے، یعنی یہ کہ وہ عملی مسائل کا فیصلہ نفسیات کے سائنسی طریقے کے بجائے روایتی تعصب سے کریں۔ ان میں سے اکثر بچوں کی جنسی نفسیات کو ایک ناپاک موضوع خیال کریں گے جس سے ناواقف رہنا ہی بہتر ہے؛ چنانچہ وہ خوش قسمتی سے اپنی ناواقفیت کے مضر اثرات سے بے خبر رہتے ہیں۔

بہت سے بچے جب دو سال کی عمر کو پہنچتے ہیں تو

انھیں پہلے ہی سکھا دیا گیا ہوتا ہے کہ وہ اپنے اعضائے مخصوصہ کو توہم پرستانہ طور پر ایک حد تک پُر اسرار اور دہشت ناک چیز خیال کریں اور ان کے متعلق ایک خاص الخاص طریقِ کار کو ضروری سمجھیں؟ انھیں سکھایا جاتا ہے کہ اپنے فطری حوائج کو سرگوشی یا حسنِ تعبیر سے ظاہر کیا کریں اور اگر وہ اپنے جسم کے ان اعضا کو جنھیں ان کی انائیں نا قابلِ مس خیال کرتی ہیں، مس کرتے ہوئے دیکھ لیے جائیں تو انھیں نہایت سختی سے نصیحت کی جاتی ہے۔ میں بہت سے ایسے مردوں اور عورتوں کو جانتا ہوں کہ جب وہ بچے تھے تو ان کی ماؤں نے انھیں اس فعل میں مصروف دیکھا تو کہا اس سے بہتر ہے کہ وہ مر جائیں۔ ایسے واقعات عام ہیں۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی بدولت رسمی نیکیوں کے نمونے پیدا نہ ہو سکے۔ بہت چھوٹی عمر کے بچوں میں بھی مشت زنی کی عادت تقریباً عالم گیر ہے اور عام طور پر اس کا تدارک خوفناک دھمکیوں سے کیا جاتا ہے۔ جرمنی میں،جیسا کہ فرائڈ بیان کرتا ہے، بچوں سے کہا جاتا ہے کہ لق لق ان کے اعضائے مخصوصہ کو کاٹ لے جائے گا اور اگر اتفاق سے وہ کسی لڑکی کو ننگا دیکھ پاتے ہیں تو غالباً خیال کرتے ہیں کہ ضرور اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ تحلیلِ نفسی کے لٹریچر کا مطالعہ کرنے والوں کو ایسے واقعات کا اچھی طرح علم ہے، لیکن ایسے لٹریچر کا پڑھنا ان لوگوں کے لیے غیر قانونی حیثیت رکھتا ہے جس کی نا واقفیت سے مضر اثرات کے پیدا ہونے کا

احتمال ہو سکتا ہے۔ بعد کی زندگی میں جو اعصابی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں ان کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بچوں کو جلق کے نتائجِ بد سے ڈرانے کے لیے دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ مدرسے کی زندگی کے دوران میں بچوں سے استاد یہ کہتے رہتے ہیں کہ جلق کا نتیجہ دیوانگی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جلق کے نتائجِ بد کے بارے میں بچوں کو ڈرانے کا نتیجہ اکثر دیوانگی کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔ لیکن جلق بجائے خود جب تک بالغ لوگ اس سے چشم پوشی کرتے رہیں، بالخصوص بچپن میں بہت کم نقصان پہنچاتی ہے۔

بچوں کے دنیا میں آنے کے طریقے کے بارے میں رازداری سے کام لینا بہت سے برے اثرات رکھتا ہے۔ اول اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ بعض علوم برے ہیں، بالخصوص یہ کہ دلچسپ علم برا ہوتا ہے۔ ہر معقول علمِ اخلاق کا بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ ہر علم اچھا ہے اور اس میں کسی استثنا کی گنجائش نہیں۔ جو بچہ یہ دیکھتا ہے کہ بعض پہلوؤں میں اس کے قدرتی ذوقِ جستجو کو چینِ جبیں اور تیوریوں سے روکا جاتا ہے وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ علم اس صورت میں تو اچھا ہوتا ہے جب وہ غیر دلچسپ ہو لیکن جب دلچسپ ہو تو برا ہوتا ہے۔ اس طرح سے سائنسی ذوقِ جستجو نیکی کی ضد بن جاتا ہے اور بچے کی نیک بننے کی خواہش احمق بننے کی خواہش بن کر رہ جاتی ہے جو افسوس ہے کہ اکثر اوقات کامیاب ہوتی ہے۔ لڑکیوں کو حمل کی حقیقت سے تاریکی میں رکھنا بھی بہت برا ہے۔ لڑکیاں اپنے آپ کو لڑکوں

سے گھٹیا خیال کرنے لگتی ھیں اور خواھش کرنے لگتی ھیں کہ کاش وہ لڑکے ھوتیں۔ جب تک انھیں حمل کے متعلق کچھ نہیں بتایا جاتا،انھیں یوں معلوم ھوتا ھے گویا تقریباً ھر معاملے میں مرد عورتوں سے بہتر ھیں۔ میں نے ایسی لڑکیاں دیکھی ھیں کہ جوں ھی انھیں معلوم ھو گیا کہ عورتوں کو بچوں کی پیدائش میں کیا کردار ادا کرنا پڑتا ھے، ان کے دل میں اپنی صنف کی نئی عزت اور لڑکی ھونے کے متعلق نیا اطمینان پیدا ھو گیا ؛ لیکن اگر بچوں کو باپ کا حصۂ کار بتائے بغیر ماں کا حصہ ھی بتایا جائے تو لڑکوں سے بالکل ویسی ھی بے انصافی ھوگی جیسی لڑکیوں سے مکمل خاموشی کی صورت میں۔ علاوہ بریں جو بچے باپ سے زیادہ مانوس ھوتے ھیں ، انھیں یہ معلوم کر کے خوشی ھوتی ھے کہ انھیں باپ کے ساتھ بھی ویسا ھی جسمانی تعلق ھے جیسا ماں کے ساتھ۔ لڑکوں کے جذبۂ خود حرمتی کے پیش نظر انھیں یہ جاننا ضروری ھے کہ عملِ پیدائش میں باپ نے کیا حصہ لیا ھے، جیسا کہ لڑکیوں کے اس احساس کے لیے ضروری ھے کہ وہ حمل کے بارے میں ماں کا حصہ معلوم کریں۔

جنسیات کے بارے میں خاموشی اختیار کر لینے کا ایک اور برا اثر یہ ھے کہ بچوں کو معلوم ھو جاتا ھے کہ ان کے والدین ان سے جھوٹ بولتے ھیں۔ بچوں کو حقیقتِ حال کا علم عموماً اس وقت سے (یعنی والدین کے اندازے سے) بہت پہلے ھو جاتا ھے ، چنانچہ جب انھیں علم ھو جاتا ھے تو والدین سے اکثر سوالات کرتے رھتے ھیں

اور ان کے جھوٹے جوابات کو ایک نوجوان کی خشک مزاجی سے ذہن نشین کرتے رہتے ہیں۔ بچوں کے سامنے جھوٹ بولنا، اگرچہ ماہرینِ اخلاقیات اس سے اتفاق نہیں کرتے، بہت ہی بری عادت ہے اور جو ضابطۂ اخلاق اس کا تقاضا کرے، یہ مشکل صحت مند ہو سکتا ہے۔

یہ ضروری ہے کہ جنسیات کے بارے میں بھی اسی لب و لہجے اور اسی طریقے سے معلومات بہم پہنچائی جائے جیسے دوسرے موضوعوں کے بارے میں بہم پہنچائی جاتی ہے اور معلومات بالکل صاف الفاظ میں ہونی چاہیے۔ ایک دبستانِ فکر ایسا بھی ہے جس کا خیال ہے کہ بچوں کو پہلے پھولوں کی محبت کے بارے میں بتایا جائے، پھر جھینگا مچھلی کی معصوم اچھل کود کے بارے میں اور پھر لمبی چوڑی خیاتیاتی تمہید کے بعد خود اپنے والدین کے طور طریقوں کے بارے میں جس کے متعلق وہ اس وقت تک یہ خیال کرنے لگیں گے کہ ایک لمبی چوڑی عذر خواہی کی ضرورت ہے۔ لیکن صرف خود تنقید کا شکار ہونے والے بالغ ہی اس لمبی تمہید کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ ایک بچے کے لیے بشرطیکہ بالغوں کی بناوٹی شرم نے اس کا ستیاناس نہ کر دیا ہو، جنسی موضوع دوسرے موضوعوں کی طرح بالکل قدرتی معلوم ہوتا ہے لیکن اگر والدین خود اس موضوع پر آزادی سے گفتگو کرنے کے ناقابل ہوں تو انہیں کسی ایسے آدمی سے گفتگو کی درخواست کرنی چاہیے جسے روایات اور بےجا رکاوٹوں نے کم مسخ کیا ہو۔ بلوغت سے پہلے بچے کو جنسیات کے بارے میں

فطری رویہ رکھنے اور اسے باقی کلی طور پر مسائلِ حیات کی طرح دیکھنے میں قطعاً کوئی دقّت پیش نہیں آتی ۔ یہ نصب العین زندگی بھر پیش نظر رہنا چاہیے لیکن بعد از بلوغ اس کا حصول مشکل ہو جاتا ہے ۔ اگر بچوں کی تربیت معقولیت سے کی جائے تو یہ مشکل سنِ بلوغ کے بعد بھی اس صورت کے مقابلے میں بہت کم ہوگی جب غیر معقول ڈر اور ممنوعات ان کے دِلوں میں ٹھونس دیے گئے ہوں ۔

بڑے لڑکے اور لڑکیوں کے بارے میں جو مسائل پیش آتے ہیں ان کا حل کسی یقینی جنسی ضابطۂ اخلاق کے بغیر مشکل ہے ۔ عام رائے یہ ہے کہ مکمل پرہیزگاری مد نظر رہنی چاہیے اور اس سے کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی ۔ انگلستان میں جنس مخالف کے ساتھ ہر طرح کے تعلقات، چند غیر معمولی من چلے نوجوانوں کے سوا، مردوں کو عورتوں سے علیحدہ کر کے روک دیے گئے ہیں، اس لیے اکثر غیر معمولی جرأت کے نوجوانوں کا میلان ہم جنسی تعلقات کی طرف ہو جاتا ہے اور زیادہ تھڑدلوں کا جلق کی طرف ۔ لڑکوں سے یہ کہا جاتا ہے اور ان میں سے اکثر اُسے درست بھی مانتے ہیں کہ یہ کام برے اور نقصان دہ ہیں؛ چنانچہ وہ یہ کام چوری چھپے کرتے ہیں کیوں کہ اگر پتا چل جائے تو انھیں سخت سزائیں دی جاتی ہیں ۔ افشائے راز بلا شبہ زیادہ تر اتفاق معاملہ ہے اس لیے سزا غیر موزوں اور غیر متوزان طریقے پر دی جاتی ہے ۔لیکن جن لوگوں کا راز فاش نہیں ہوتا ان پر سزا کے ڈر اور چھپانے کی عادت

کا لازماً برا اثر پڑتا ہے ۔ پبلک سکولوں میں ذہانت کو نیکی پر قربان کرنے کا رحجان پایا جاتا ہے اور لڑکے اتنے مشغول اور جسمانی طور پر اتنے تھکے ہوئے رکھے جاتے ہیں کہ نہ تو انہیں جنسیات کی فرصت ہوتی ہے نہ رغبت ۔ پس موجودہ طریقے میں مندرجہ ذیل نقائص پائے جاتے ہیں ؛ اول اس سے لڑکوں کے دلوں میں وہمی ڈر جڑ پکڑ جاتا ہے ، دوم ان کی بڑی تعداد بزدل اور منافق بن جاتی ہے ، سوم جنسیات کے بارے میں خیالات و احساسات فحش اور پوشیدہ صورت اختیار کر لیتے ہیں ، چہارم سائنسی ذوقِ جستجو گناہ معلوم ہونے لگتا ہے ، چنانچہ یہ یا تو فنا ہو جاتا ہے یا کمھلا جاتا ہے، پنجم اس سے اوقاتِ فرصت کی حوصلہ فرسائی ہوتی ہے اور اسی لیے ذہنی نشو و نما کی بھی ۔

موجودہ طریق کار کے ان نقائص کے باوجود ضابطۂ اخلاق کو مکمل طور پر بدلے بغیر کسی ایسے نظام کا تصور بھی آسان نہیں جو سنگین اعتراضات سے بری ہو ۔ زمانۂ حاضر کے معاشرے میں اکثر مردوں کے بلوغ اور شادی کے درمیان خاصے سالوں کا وقفہ ہوتا ہے ؛ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انہیں یہ عرصہ مکمل پرہیزگاری سے بسر کرنا چاہیے تو یہ یقینی بات ہے کہ ان میں سے اکثر مرد ایسا نہیں کریں گے ، لیکن جب تک موجودہ ضابطۂ اخلاق موجود ہے ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص اسے توڑے اور کوئی نقصان نہ اٹھائے ۔ بازاری عورتوں کے پاس جانا برا فعل ہے ۔ اول اس لیے کہ اس

میں بیماری کا خطرہ ہے ، دوم اس لیے کہ طوائف کا پیشہ اس وقت تک ضرور ناپسندیدہ ہے جب تک معاشرہ طوائفوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا رہے گا ، سوم اس لیے کہ اگر ایک مرد کا پہلا جنسی تجربہ ہی روپے پیسے پر مبنی اور جذبات سے خالی ہوگا تو ممکن ہے جب اس کی شادی ہو تو وہ بیوی کو یا تو طوائف سمجھنے لگے اور یا خدا رسیدہ صوفیہ اور دونوں حالتوں میں نتیجہ مسرت کی صورت میں نہیں نکلے گا ۔ زمانۂ بلوغ کے بعد اگرچہ جلق اتنی مضر نہیں جتنی روایتی اخلاق کے حامی کہتے ہیں مگر بلاشبہ اس میں سنگین برائیاں موجود ہیں ، اس سے انسان کے خودبین اور بزدل ہو جانے کا احتمال ہے اور بعض اوقات جلق کی وجہ سے وہ طبعی مباشرت کے قابل بھی نہیں رہتا ۔ اگر لڑکوں کے ساتھ ہم جنسی تعلقات کو برداشت کر لیا جائے تو ممکن ہے وہ زیادہ مضر نہ ہوں لیکن اس میں بھی یہ خطرہ ہے کہ مبادا وہ بعد کی فطری جنسیاتی زندگی کی نشو و نما میں رکاوٹ ثابت ہوں ۔ اگر دونوں صنفوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہ رکھا جائے تو احتمال ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان کافی جنسی روابط پیدا ہو جائیں گے ، جو نہ صرف ان کی تعلیم میں بری طرح حارج ثابت ہوں گے بلکہ ایسی عمر میں حمل ہونے لگیں گے جب ان کا وقوع ناپسندیدہ ہوگا ۔ میرے خیال میں معاشرے اور رائے عامہ کی موجودہ حالت کے پیش نظر اس مشکل کا کوئی حل نہیں ۔ شاید کوئی وقت ایسا آجائے جب ان نفسیاتی قباحتوں کو جو زمانۂ بلوغ

میں موجودہ ضابطۂ اخلاق سے پیدا ہو جاتی ہیں ، اتنا خطرناک سمجھا جانے لگے کہ لڑکے اور لڑکیوں کو اس قسم کی آزادی مل جائے جیسی سموا (Samoa) اور بحرالکاہل کے دوسرے بہت سے جزیروں میں موجود ہے۔ اگر کبھی ایسی حالت پیدا ہو گئی تو منع حمل کی تدبیروں کی ضروری تعلیم دینی پڑے گی اور اگر ان کے باوجود حمل رہ جائے تو اسے فوراً روکنا پڑے گا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اس صورت حال کو پسند کرتا ہوں اور شاید یہ بھی معلوم ہو جائے کہ زمانۂ بلوغت کی پرہیزگاری کوئی ناقابلِ برداشت بوجھ نہیں ڈالتی ، اگر یہ امید ہو کہ اس کی ضرورت تقریباً بیس برس کی عمر میں ختم ہو جائے گی۔ یہ چیز جج لنڈزے (Judge Lindsay) کی پیش کردہ "رفیقانہ شادی" کے رواج سے حاصل ہوسکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یونیورسٹی کے اکثر طلبہ عارضی بے اولاد شادی کر لیا کریں تو یونیورسٹی کی زندگی اخلاق اور ذہنی اعتبار سے بہتر ہو جائے ، اس سے جنسی خواہش کا ایسا حل مل جائے گا جس میں نہ اضطراب ہوگا اور نہ چوری چھپے کی ضرورت ، یہ نہ تو اجیرانہ ہوگا اور نہ محض اتفاق ؛ اس کی نوعیت کچھ ایسی ہوگی کہ جو وقت کام کے لیے درکار ہوگا وہ لازماً ضائع نہ ہوگا۔

قبل بلوغ کی جنسی تعلیم کے مسئلے پر ہم ذہنی صحت کے قاعدوں کے مطابق جنسی اخلاق پر کوئی خاص معین رائے قائم کیے بغیر بحث کر سکتے ہیں ، لیکن جب تک ہم جنسی کردار سے متعلق موزوں اور غیر موزوں

کے درمیان کافی واضح رائے قائم نہیں کر لیتے اُس وقت تک یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہے کہ مدرسے کے آخری سالوں اور یونیورسٹی میں جنسیات کے بارے میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے ۔ اس وقت بہت سے لوگوں کا جنسی ضابطۂ اخلاق ایک ملغوبے کی شکل رکھتا ہے جس کے تین بڑے بڑے منبعے ہیں ۔ اول بیویوں کی نیکی پر اصرار جو سرقبیلی (Patriarchal) ادارے کے لیے ضروری ہے ، دوم عیسائیت کا یہ عقیدہ کہ شادی کے بغیر سب جنسی تعلقات گناہ میں داخل ہیں ، سوم عہدِ حاضر کا جدید ترین نظریہ کہ عورت مرد کے برابر ہے ۔ ان تین عناصر میں سے وہ عنصر جس کا تعلق سرقبیلی خاندان سے ہے ، سب سے زیادہ پرانا ہے ؛ اسے آج جاپان میں دوسرے دونوں عناصر کے بغیر دیکھا جا سکتا ہے ۔ جاپانی ہر قسم کی جنسی ممنوعات سے آزاد ہیں اور ان کے جنسی اخلاق میں توہمات کو بہت کم دخل ہے ، صنفی برابری کا کوئی دکھاوا نہیں کیا جاتا بلکہ عورتوں کو پوری سختی سے مردوں کے ماتحت رکھا جاتا ہے ۔ سرقبیلی نظام نہایت مضبوطی سے قائم ہے جس کے اجرا کے لیے لفظی اخلاق وعظ نہیں کیے جاتے بلکہ بیویوں کو مغلوب و مطیع رکھا جاتا ہے ۔ چھوٹے بچوں کو جنسی معلومات ، جنسی گفتگو اور جنسی کھیل کود کی اس حد تک اجازت ہے کہ یورپ کے باشندوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے ۔ بالغ زندگی کے ضابطۂ اخلاق کا اطلاق صرف عورتوں پر کیا جاتا ہے اور مرد اپنی قوت مقتدرہ سے کام لے کر عورتوں پر اس ضابطے

کو سختی سے عائد کرتے ہیں ۔ یہ ایک قدیم نظام ہے جو عیسائی تہذیب سے پہلے تقریباً عالم گیر تھا ۔

عیسائیت نے اپنے ابتدائی دور میں اس عقیدے کی اشاعت کی کہ جنسی تعلقات میں فطری طور پر گندگی پائی جاتی ہے جو صرف اس بنا پر قابلِ در گزر ہیں کہ ان سے انسانی نسل میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور گو یہ تعلقات شادی تک ہی محدود رہیں، جب بھی وہ تجرد کے برابر واجب‌الاحترام نہیں ہو سکتے ۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ عیسائیت سے پہلے لوگوں میں ان خیالات کا وجود نہ تھا؛ انسانی فطرت میں ایک عنصر ایسا ہے جو انسان کو جنسی جذبات کی مخالفت کا عادی بنانا چاہتا ہے؛ چنانچہ عیسائیت نے زیادہ تر انھی عناصر سے اپیل کی جو پہلے سے موجود تھے ۔ یہودیوں میں جنسیات کے متعلق زبردست امتناعی احکام موجود تھے لیکن خود جنسی تعلقات کی ناپاکی کا کوئی احساس موجود نہ تھا، گو اسفار قدیمہ میں اس طرح کے احساسات کے پیدا ہونے کے کچھ آثار ملتے ہیں ۔

تاریخ میں سب سے پہلے عیسائی اخلاق نظری طور پر مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے برابر قرار دیا گیا ۔ اگرچہ عملاً غلط روی کی صورت میں عورت کے مقابلے میں مرد سے زیادہ نرمی برتی جاتی تھی ۔ عملی طور پر عیسائی طریق کار اور قبل از عیسائیت کے سر قبیلی تمدن میں بہت زیادہ فرق نہ رہا، اگرچہ یہ بڑا نفسیاتی فرق باقی رہا کہ مردوں کی جنسی آزادی کو گناہ سمجھا جانے لگا ۔

جنسی مساوات کے صرف سے یہ نظام ٹوٹ گیا۔ نسوانیت کے حامیوں کی توقع کے مطابق یا تو مردوں کو بھی عورتوں کی طرح اتنا ہی پرہیزگار ہونا چاہیے یا عہد حاضر کے نسوانیت دوست لوگوں کی وکالت کے مطابق عورتوں کو بھی اتنی گناہ گاری کی اجازت مل جانی چاہیے جتنی مردوں کو حاصل ہے، لیکن اگر عورتوں سے نیک چلنی کا مطالبہ نہ کیا جائے تو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ سرقبیلی نظام کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے اور سرقبیلی کنبے کو چھوڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشری نظام میں گہری تبدیلیاں پیدا ہوں گی، پس نتیجہ پریشان خیالی ہے۔ عیسائی ضابطۂ اخلاق مرد کے مزاج کے لیے ہمیشہ صبر آزما رہا ہے۔ اگر عورتوں کو بھی مردوں کی طرح آزاد ہونا ہے تو وہ بھی اس ضابطۂ اخلاق کو ناقابلِ برداشت طور پر سخت پائیں گی۔ کنبہ ایک ایسا ادارہ ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہیں اور مرد اس کی قلبِ ماہیت کے لیے بخوشی رضامند نہ ہوں گے۔ اس پریشانی میں صرف ایک مسئلہ وضاحت سے نظر آتا ہے کہ باپ کی ذمہ داریوں کو حکومت اپنے سر لے لے اور یہ ایسا نظام ہے کہ اسے اشتمالیت کے ماتحت تو اپنا لینا آسان ہے لیکن ذاتی جائداد اور وراثت کے اداروں کے ہوتے اپنانا اتنا آسان نہیں؛ اس لحاظ سے ذاتی جائداد کا مسئلہ جنسی اخلاق کے مسئلے کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے۔ یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ مرد ان بچوں کے پالنے کے لیے محنت کرے گا جو اس کے

نطفے سے نہیں ، اس لیے ذاتی جائداد سر قبیلی تمدن سے مل کر بیویوں میں ایک خاص حد تک نیک کرداری کا مطالبہ کرتی ہے۔ مردوں کو مستثنیٰ قرار دے کر عورت سے نیک چلنی کا مطالبہ کرنا جنسی مساوات کے اصول کے خلاف ہے اور یہ سمجھنا مشکل ہے کہ تشدد یا ممنوعات کے بغیر نیک چلنی کیونکر حاصل ہو۔ مجھے بلا شبہ اس عقیدے کا حل اسی میں نظر آتا ہے کہ باپ کی اہمیت روز بروز کم ہو رہی ہے اور یہ رجحان روز بروز بڑھ رہا ہے کہ بچوں کی تربیت کی ذمہ داری باپ کے بجائے حکومت کو سنبھالنی چاہیے۔ میں ہرگز یقین سے نہیں کہ سکتا کہ یہ اچھی بات ہوگی؟ جذبات ولدیت اور باپ کے متعلق بچوں کے احساسات انسانی تمدن کی تاریخ میں نہایت ہی گہرے اور اہم عنصر رہے ہیں اور میں یہ جاننے کا دعویٰ نہیں کرتا کہ ان احساسات کے بغیر تمدن کیسا بن جائے گا۔لیکن اچھا ہو یا برا ، بچوں کے بارے میں حکومت کی اہمیت ضرور بڑھ کر رہے گی اور اسی نسبت سے باپ کی اہمیت گھٹ جائے گی۔

جن لوگوں کا تعلق بچوں کی تعلیم سے ہے وہ ان تمام مسائل اور پریشانیوں پر غور کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سخت اور بے لچک عیسائی ضابطۂ اخلاق کی پابندی گو بالغوں سے نہ کرائی جا سکے لیکن جو لوگ بچوں کے نگران ہوں ان کے طور طریقے ضرور اس کے مطابق ہوں۔ برطانیہ کے سکولوں اور

یونیورسٹیوں کا اخلاق انداز باقی دنیا کے مقابلے میں زیادہ بے لچک ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ روز بروز تعلیم کا رابطہ اس معاشرے سے جس کے لیے بچوں کو تیار کیا جاتا ہے، کم ہوتا جاتا ہے۔ جب تک رائے عامہ اور سماجی ادارے موجودہ حالت میں ہوں، میرے خیال میں کوئی واضح حل ممکن نہیں، کیوں کہ بنیادی طور پر مساوات جنسی کے نظریے اور سرقبیلی خاندان میں ہم آہنگی نہیں۔ بہر حال اس تضاد کے باوجود اگر عام اخلاق اصول مد نظر رکھے جائیں اور جنسی تعلقات کو ضعیف الاعتقادی کی عینک سے دیکھنا ترک کر دیا جائے تو بہت سی باتوں کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں یہ قطعی اصول بنا لینا چاہیے کہ بچوں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت بلند بانگ جھوٹ کبھی نہ بولے جائیں۔ یہ اصول بالکل حتمی ہونا چاہیے کہ ہر موضوع پر عقل و دانش کی بنا پر اور سائنسی طریقے پر غور کیا جا سکتا ہے۔ اگر اخلاق کی اساس ہی سر قبیلی خاندان کا تحفظ ہے تو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس اساس پر ایسے جنسی تعلقات کیوں کر گناہ سے خالی قرار دیے جا سکتے ہیں جن سے اولاد نہ پیدا ہو سکے، حالانکہ ایسے تعلقات کو نہ صرف عیسائی ضابطۂ اخلاق ہی بلکہ تعزیری قوانین بھی نفرت سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں اس چیز کا احساس بھی ہونا چاہیے کہ جب کوئی خاص طور طریقہ به ذات خود پسندیدہ بھی ہو تو اسے بے لچک ضبط یا مریضانہ قسم کی دہشت کے ذریعے نافذ کرنا غیر پسندیدہ

ھوتا ہے ۔ یہ اصول بچوں کی اخلاق تعلیم کے ایک بڑے حصے پر حاوی ھیں ۔ باق امور کے لیے میرا خیال ہے ھمیں ضرور اُس وقت تک انتظار کرنا چاھیے جب تک ھمارا پریشاں حال اور تیزی سے بدلنے والا معاشرہ کوئی مستحکم صورت نہ اختیار کر لے ۔

بچوں سے رابطہ رکھتے وقت یہ امر ضروری ہے کہ ان کے دل میں یہ خیال نہ آنے پائے کہ جنسی تعلق فطرتاً ناپاک یا چھپانے کے قابل چیز ہے ۔ جنسیات ایک دل چسپ موضوع ہے اور انسانوں کا اس کے متعلق گفتگو کرنا اور غور کرنا قدرتی امر ہے ۔ موجودہ حالات میں اربابِ اختیار نوجوانوں کی اس بالکل قدرتی خواھش کو تقریباً فسق سے تعبیر کرتے ھیں ؛ نتیجةً نوجوانوں کو اس موضوع سے اس سے کہیں زیادہ دل چسپی پیدا ھو جاتی ہے جتنی عام حالات میں ھوتی، اور وہ اس کے متعلق اجتماعی طور پر باتیں کر کے شجرممنوعہ کا لطف اٹھاتے ھیں ؛ ان کی گفتگو لازمی طور پر احمقانہ اور بے خبرانہ ھوتی ہے کیوں کہ انھیں اپنے اندازے اور کم علمی کے رحم ھی پر چھوڑ دیا جاتا ہے ۔ اکثر لڑکوں کے لیے جنسیات کا سارا موضوع ھی مضحکہ خیز اور غلیظ کہانیوں کا مجموعہ بن جاتا ہے ۔ جنسیات کا سارا تصور ھی، جو قدرتی مسرت کا سرچشمہ ہے، جو انسان کو کبھی شعر کہنے پر اکساتا ہے اور کبھی خوشی و خرمی پر، اور جو کبھی پرجوش الم انگیز گہرائیوں میں پھینک دیتا ہے، ایسے مُلّا منش ماھرینِ اخلاق

کی حدِ بصیرت سے باہر ہے جن کے نزدیک یہ جذبہ اگر مسرت انگیز ہو تو فسق ہے اور اگر بے کیف اور عادی قسم کا ہو تو قابلِ ستائش۔ یہ مکروہ اخلاقیت زندگی کو شاعری، مسرت اور حسن سے کاملاً محروم کر دیتی ہے اور انسانی تعلقات میں کڑا پن اور روکھا پن داخل کر دیا جاتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر بناوٹی شرم و حیا، بے حوصلگی اور فکر کی موت پیدا کرتا ہے۔ ممکن ہے ایک آزاد تر نقطۂ نگاہ میں بھی خطرے ہوں لیکن وہ زندگی کے خطرے ہوں گے، موت کے نہیں۔

باب دھم

تعلیم میں حُبِّ وطن کا مقام

ہر آدمی بہت سے مقاصد اور خواھشات رکھتا ھے جن میں سے بعض تو خالص ذاتی ھوتی ھیں اور بعض ایسی جن کے بارے میں وہ دوسرے بہت سے لوگوں سے اشتراک کر سکتا ھے؛ مثلاً بہت سے لوگ روپیہ چاھتے ھیں اور دولت کمانے کے اکثر طریقے کسی نہ کسی گروہ کا تعاون چاھتے ھیں اور متعلقہ گروہ کا انحصار امیر ھونے کے مخصوص طریقے پر ھوگا۔ ایک ھی صنعت کے دو مختلف کارخانے اکثر معاملات میں ایک دوسرے کے رقیب ھوتے ھیں لیکن حفاظتی محاصل کے بارے میں وہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے ھیں۔ بلا شبہ روپیہ ھی ایک ایسی چیز نہیں جس کی خاطر لوگ سیاسی قسم کے گروھوں میں تقسیم ھو جاتے ھیں؛ مثلاً وہ مختلف مذھبی فرقوں، برادریوں علمی سوسائٹیوں اور فری میسن گروھوں اور نہ معلوم کن کن جماعتوں میں بٹ جاتے ھیں۔ انسانوں کو مختلف گروھوں میں تقسیم کرنے والے محرکات متعدد ھیں، مثلاً مقاصد کی ھم آھنگی ان میں سے ایک ھے، خیالات کی یکسانی دوسرا اور خونی رشتے تیسرا۔ راسچائلڈ (Rothschild) خاندان کے لوگوں نے خونی رشتے کی

وجہ سے ایک دوسرے سے تعاون کیا ۔ انھیں اس ہیئیت اجتماعی کے لیے رسمی دفعات کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ وہ ایک دوسرے پر اعتبار کر سکتے تھے ۔ ان کی کامیابی کی ایک وجہ یہ تھی کہ یورپ کے ہر اہم تجارتی مرکز میں ایک رانسچائلڈ موجود تھا ۔ باہمی تعاون کی ایسی مثال جس کا مدار خیالات کی ہم آہنگی پر ہو ، زمانۂ ما بعد جنگ میں کوئیکر (Quaker) جماعت کے انسانیت نواز کار نامے ہیں ۔ چونکہ ان کا نظریۂ حیات ایک تھا اس لیے وہ آسانی سے تعاون کر سکے ۔ مشترک سرمائے کی کمپنیاں اور مزدوروں کی انجمنیں ایسے ادارے ہیں جن کی بنیاد ذاتی مفاد کی ہم آہنگی پر ہے ۔

انسانوں کی جس جماعت کو کسی خاص مقصد کے لیے منظم کیا جائے ، اس کا مقصد اجتماعی اعتبار سے وہی ہوتا ہے جس کے لیے اس کی تنظیم کی جاتی ہے ، اس لیے اس کی ذہنیت ایک فرد کے مقابلے میں زیادہ سادہ اور زیادہ نا تمام ہوتی ہے ؛ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ نفسیاتی تحقیقات کی انجمن صرف نفسیاتی تحقیق ہی سے سروکار رکھتی ہے ، گو اس کے رکن کے پیش نظر اور بھی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں ۔ برطانوی صنعتوں کی وفاقی انجمن صرف برطانوی صنعت و حرفت کا خیال رکھتی ہے ، اگرچہ اس کے ارکین تماشوں اور کرکٹ کے میچ سے بھی لطف اٹھا سکتے ہیں ۔ مجموعی طور پر ایک خاندان صرف خاندانی جائداد کا خیال رکھتا ہے اور اکثر اپنے کسی ایک فرد کو اس مقصد پر قربان کر دینے کے

لیے تیار رھتا ھے۔

ایسے ولولے جو سیاسی طور پر منظم کر لیے جائیں غیر منظم جذبات کے مقابلے میں بہت زیادہ طاقتور ھوتے ھیں؛ جو لوگ اتوار کو سنیما دیکھنا چاھتے ھیں وہ بالکل ایک غیر منظم بھیڑ ھوتی ھے اور سیاسی لحاظ سے بالکل بے وقعت۔ وہ سبتی (Sabattarians) جو یہ خواھش رکھتے ھیں کہ لوگ نہ جائیں، منظم ھوتے ھیں اور سیاسی اثر و نفوذ رکھتے ھیں۔ سنیما کے مالک بھی منظم ھوتے ھیں اس لیے سیاسی نقطۂ نگاہ سے اتوار کے دن سنیما کھلا رکھنے کا سوال سنیما کے مالکوں اور سبتیوں کے درمیان مابہ النزاع ھے جس میں عوام کی رائے کی کوئی اھمیت نہیں۔

ایک خاص آدمی مختلف جماعتوں کا رکن ھوسکتا ھے جن میں سے بعض مفید، بعض مضر اور بعض بے ضرر قسم کی ھوں گی۔ فرض کیجیے ایک آدمی برطانوی فاشی جماعت، گاؤں کی فٹ بال ٹیم اور تحقیقِ انسانیت کی مجلس کا رکن ھے؛ وہ تیسری حیثیت سے قابلِ تعریف، دوسری حیثیت سے معصوم اور پہلی حیثیت سے قابلِ نفرت ھے۔ وہ خود نیکی اور برائی کا مجموعہ ھے۔ لیکن ان اداروں کا اخلاقی کردار اچھا یا برا جو کچھ بھی ھے، غیر مخلوط ھے جو ان اراکین میں نہیں پایا جاتا۔ اس امر کا انحصار کہ آیا کون انجمن اچھی ھے یا بری، انجمن میں شامل ھونے والے لوگوں کے کردار پر نہیں ھوتا بلکہ اس مقصد پر ھوا کرتا ھے جس کی خاطر لوگوں کی تنظیم

کی جاتی ہے ۔ ان پیش پا افتادہ خیالات کے اظہار کا مقصد ان عجیب نتائج تک پہنچنا ہے جو انسانوں کی اس تنظیم سے صادر ہوتے ہیں جسے ریاست کہتے ہیں۔ تقریباً تمام مہذب ممالک میں ریاست ان تمام تنظیموں سے زیادہ طاقتور ہے جن کے ساتھ انسان کا تعلق ہوتا ہے ، اس لیے حکومت کا رکن ہونے کی حیثیت سے اس کے مقاصد سیاسی لحاظ سے دوسرے تمام مقاصد کے مقابلے میں بہت زیادہ مؤثر ہوتے ہیں ، اس لیے اس مسئلے پر غور کرنا اہم ہو جاتا ہے کہ زمانۂ حاضر کی ریاست کے مقاصد کیا ہیں ۔

ریاست کے فرائض کچھ تو داخلی ہوتے ہیں اور کچھ خارجی اس لیے میں مقامی حکومت کو بھی ریاست کے فرائض میں شامل کرتا ہوں ؛ مجملاً یوں کہا جا سکتا ہے کہ ریاست کے داخلی فرائض تو اچھے ہیں لیکن خارجی برے ۔ یہ بیان بلاشبہ اتنا سادہ ہے کہ حرف بہ حرف درست نہیں ہو سکتا لیکن یہ اولین مفید تخمینے کا قائم مقام ہے۔ حکومت کے داخلی فرائض میں سڑکیں ، روشنی ، تعلیم ، پولیس، قانون اور ڈاک خانہ وغیرہ شامل ہیں ۔ ملکی انتظام کی تفصیلات کے بارے میں تو کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن صرف ایک نراجی ہی یہ کہے گا کہ یہ مقاصد بہ ذات خود غیر پسندیدہ ہیں ۔ جہاں تک ریاست کی داخلی سرگرمیوں کا تعلق ہے وہ مجموعی طور پر باشندگانِ ملک کی وفاداری اور امداد کی مستحق ہے ۔

جب ہم اس کے خارجی مقاصد کی طرف آتے ہیں تو معاملہ مختلف ہو جاتا ہے ۔ باقی دنیا کے معاملے میں ایک

بڑی ریاست کے مقاصد دو ہوتے ہیں ، جارحانہ حملوں کا دفاع اور غیر ملکی وسائل کے استحصال میں باشندگان ملک کی امداد ۔ جارحانہ حملوں کا دفاع ، جب خطرہ واقعی ہو اور حملے کو روکنے کے لیے ضروری نظر آئے تو ظاہر ہے کہ اسے مفید قرار دیا جا سکتا ہے ۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو ذرائع حملوں کی روک تھام کے لیے درکار ہیں ، وہی دوسرے ممالک کے استحصال میں کار آمد ہوتے ہیں ۔ دنیا کی طاقتور ریاستوں کا مقصد کمزور ملکوں کی محنت اور ان کی معدنی دولت سے اقتصادی خراج وصول کرنا ہے اور اس خراج کی وصولی کے لیے مسلح افواج کو جن کا برائے نام مقصد دفاع ہوتا ہے ، استعمال کیا جاتا ہے ؛ مثلاً جب یہ معلوم ہوا کہ ٹرانسوال میں سونا موجود ہے تو حکومت برطانیہ نے اس پر حملہ کر دیا ، اور لارڈ سالسبری نے قوم کو یقین دلایا کہ ہمارا مقصد سونے کی کانیں حاصل کرنا نہ تھا ، لیکن ہم کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ ہی گئے جہاں سونے کی کانیں موجود تھیں اور جب لڑائی ختم ہولی تو ہم نے اپنے آپ کو ان کا مالک پایا ۔ ایک اور مثال لیجیے ؛ ہر شخص جانتا ہے کہ انگریز جنوبی ایران میں وہاں کے باشندوں کی بھلائی کے لیے گئے تھے ، لیکن یہ امر مشکوک ہے کہ اگر ایرانی اس علاقے کے باشندے نہ ہوتے جہاں تیل کا بے اندازہ ذخیرہ موجود ہے تو آیا ہم ان کی بہتری میں اتنی دل چسپی لیتے ؟ وسطی امریکہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بعض کارناموں کے متعلق بھی اس طرح کی باتیں کہی

جا سکتی ہیں ۔ اسی طرح منچوریا میں جاپان کے جانے کا محرک بھی شریف ترین جذبہ تھا لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ جاپانیوں کے مقاصد سے ہم آہنگ واقع ہوا ہے ۔

یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ اکثر طاقتور ریاستوں کی حالیہ غیر ملکی سرگرمیوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلح افواج کی امداد یا ان کی دہشت سے کام لے کر کمزور حکومتوں سے وہ دولت ہتیا لی جائے جو قانونی طور پر ان کی اپنی ملکیت ہے ۔ اس قسم کی سرگرمیاں اگر افراد سے نجی طور پر سر زد ہوں تو جرم میں شمار ہوتی ہیں اور اگر بہت وسیع پیمانے پر نہ ہوں تو ان کے لیے سزا بھی دی جاتی ہے ، لیکن اگر یہ قوموں سے صادر ہوں تو اہلِ ملک انھیں قابلِ ستائش سمجھتے ہیں ۔

اس فکر و نظر سے میں اس باب کے اصل موضوع ، یعنی مدرسوں میں حبِ وطن کی تعلیم پر پہنچ گیا ہوں؛ اس تعلیم پر تنقید سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم نہ صرف اس کے منشا بلکہ اس کے حقیقی اثرات کے متعلق بھی وضاحت سے کام لیں ۔ حبِ وطن کا منشا اس کے حامیوں کے خیال کے مطابق ایک ایسی چیز ہے جو بڑی حد تک اچھی ہے ۔ گھر کی محبت اور اپنے وطن کی محبت بلکہ ایک خاص حد تک اس کے کارناموں پر فخر کرنا جہاں تک وہ فخر کے مستحق ہیں ، یہ چیزیں مذموم نہیں ۔ یہ ایک مختلف الاجزا جذبہ ہے جو کچھ تو وطن کی محبت اور اس کے مانوس قرب و جوار سے متعلق ہے اور کچھ اس جذبے سے

وسیع تر خاندانی محبت سے مماثل ہے ۔ اس جذبے کی اساس کچھ تو جغرافیائی اور کچھ حیاتیاتی ہے لیکن یہ ابتدائی جذبہ بہ ذات خود نہ تو سیاسی ہے اور نہ اقتصادی ۔ یہ ایک آدمی کا احساس ہے اپنے وطن کے حق میں نہ کہ دوسرے ملکوں کے خلاف ۔ یہ جذبہ اپنی ابتدائی صورت میں ان دیہاتیوں کے سوا ، جنھیں سیر و سیاحت کا بہت کم اتفاق ہوا ، دوسرے لوگوں میں بہ مشکل پایا جاتا ہے ۔ جو شہری ہمیشہ اپنی سکونت کو بدلتا رہے اور جس کے پاس زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا نہ ہو جسے وہ اپنا کہہ سکے ، اس میں یہ ابتدائی جذبہ جس سے حب وطن کا احساس پیدا ہوا ہے ، دیہاتی مالکانِ زمین یا کسانوں کے مقابلے میں بہت کم ہوگا ۔ اس کے بجائے شہری میں ایک اور احساس ہوگا جو زیادہ تر مصنوعی اور اس کی تعلیم اور اخبارات کی پیداوار ہوگا اور تقریباً مکمل طور پر ضرر رساں ہوگا ۔ اس جذبے کی اساس وطن اور اہل وطن کی محبت پر اس قدر نہیں ہوتی جتنی دوسرے ممالک کی نفرت اور ان پر قبضہ کرنے کی خواہش پر ہوا کرتی ہے ۔ تمام برے جذبات کی طرح یہ جذبہ بھی وفاداری کے بھیس میں جلوہ گر ہوتا ہے ۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ کوئی انسان ایک ایسے قابلِ نفرت جرم کا مرتکب ہو جس کے نام سے بھی وہ ڈر کر پیچھے ہٹ جائے تو پہلے اس کے دل میں مہا بدمعاشوں سے وفاداری کا جذبہ پیدا کیجیے ، پھر اس جرم کو وصفِ وفاداری کے بھیس میں اس کے سامنے لائیے ۔ حبِ وطن اس طریقِ عمل کی بہترین مثال ہے ؛ مثلاً قومی

جھنڈے کے احترام کا سوال ھی لیجیے ، جھنڈا فوجی لحاظ سے قوم کا نشان ھوتا ھے ، یہ دل میں لڑائی ، جنگ ، فتح اور بہادری کے کارناموں کے خیالات پیدا کرتا ھے ۔ برطانوی جھنڈا ایک انگریز کو نیلسن اور ٹریفالگر (Trafalgar) کی یاد دلائے گا ، نہ کہ شکسپیر ، نیوٹن اور ڈارون کی ۔ جو کام انسانی تہذیب کی ترقی کے سلسلے میں انگریزوں نے کیے ھیں وہ قومی جھنڈے تلے نہیں کیے گئے اور جب اس جھنڈے کی تعظیم کی جاتی ھے تو یہ چیزیں ذھن میں نہیں آتیں ۔ انگریزوں نے اپنے بہترین کارنامے انگریزوں کی حیثیت میں نہیں بلکہ افراد کی حیثیت میں انجام دیے ھیں ۔ جو کارنامے انگریزوں نے انگریز ھونے کی حیثیت میں یا اس احساس کے ماتحت کہ وہ انگریز ھیں ، انجام دیے ھیں ، کم قابل تعریف قسم کے ھیں ، اور یہی وہ کارنامے ھیں جن کی تعریف قومی جھنڈا ھم سے کرانا چاھتا ھے ۔ جو بات انگریزی قومی جھنڈے کے بارے میں درست ھے ، وھی ستاروں اور دھاریوں والے یا کسی دوسری طاقتور قوم کے جھنڈے کے بارے میں بھی صحیح ھے ۔

تمام مغربی ممالک میں لڑکے لڑکیوں کو سکھایا جاتا ھے کہ ان کی نہایت اھم سماجی وفاداری اس ریاست کے ساتھ ھے جس کے وہ شہری ھیں اور ان کے ذمے ریاست کی طرف سے یہ فرض عائد ھوتا ھے کہ جس طرح انھیں حکومت کہے وہ ویسا ھی کریں ۔ اس خیال سے کہ مبادا وہ اس نظریے پر اعتراض کر بیٹھیں ، انھیں غلط تاریخ ، غلط سیاسیات اور غلط اقتصادیات کی تعلیم دی جاتی ھے ۔

انھیں ممالکِ غیر کی بد اعمالیوں کی روئداد سنائی جاتی ہے، لیکن اپنی حکومت کی بد اعمالیوں کی نہیں۔ انھیں یہ بتایا جاتا ہے کہ تمام وہ جنگیں جن میں ان کے ممالک نے حصہ لیا ہے، دفاعی جنگیں ہیں لیکن دوسرے ممالک کی جنگیں جارحانہ ہیں۔ انھیں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ جب ان کا ملک خلافِ توقع کسی دوسرے ملک کو فتح کر لیتا ہے تو اس کا مقصد تمدن، انجیل کی روشنی، اخلاقِ حسنہ، امتناعِ مسکرات یا اسی طرح کے اور ایسے ہی بلند مقاصد کی اشاعت ہوتی ہے؛ نیز انھیں بتایا جاتا ہے کہ دوسرے ممالک کا کوئی معیار اخلاق نہیں اور جیسا کہ انگریزوں کا قومی ترانہ کہتا ہے، ” قدرت کا یہ فرض ہے کہ دشمنوں کے بدمعاشانہ مکر و فریب کو تہس نہس کر دے“۔ قدرت کا یہ فرض ایسا ہے جس کی بجا آوری کے لیے وہ ہمیں آلۂ کار بنانے میں تامل نہیں کرے گی۔ حق یہ ہے کہ جب کسی قوم کو دوسری قوم سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ اس قدر جرائم کا ارتکاب کرتی ہے جتنے اس کی مسلح افواج سے بن پڑتے ہیں۔ عام شہری بلکہ مہذب شہری بھی اُن سرگرمیوں کو سراہتے ہیں جن کی وجہ سے یہ جرائم واقع ہوتے ہیں کیونکہ نہ تو انھیں یہ علم ہوتا ہے کہ کیا کچھ ہو رہا ہے اور نہ وہ واقعات کو صحیح پس منظر میں دیکھتے ہیں۔

ایک عام شہری نادانستہ طور پر استحصال کی خاطر قتل و خون میں شریک ہونے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ اس رضامندی کی ذمہ داری زیادہ تر تعلیم پر ہے۔ بعض

لوگ اخبارات کو برا بھلا کہتے ہیں لیکن میری رائے میں وہ اس معاملے میں غلطی پر ہیں ۔ اخبارات ویسے ہی ہوں گے جیسے عوام چاہیں گے اور عوام برے اخبارات پسند کرتے ہیں کیونکہ ان کی تعلیم برے طریقے پر ہوتی ہے ۔ قوم پرستانہ جذبۂ حب وطن مدرسے میں سکھائے جانے کے بجائے ایسا انبوهی هسٹیریا ہے جس کی زد میں بد قسمتی سے لوگ آ جاتے ہیں اور جس سے بچاؤ کے لیے انہیں ذهنی اور اخلاق طور پر مستحکم بنایا جانا چاہیے ۔ بلاشبہ جذبۂ قومیت ہمارے عہد کی سب سے زیادہ خطرناک برائی ہے جو شراب نوشی ، مسکرات ، کاروباری بد دیانتی اور اس طرح کی دیگر برائیوں سے بھی خطرناک ہے جن سے بچنا رسمی اخلاق تعلیم کا منشا ہے ۔ تمام وہ لوگ جو دنیاے جدید کا جائزہ لینے کی اہلیت رکھتے ہیں ، جانتے ہیں کہ جذبۂ قومیت کی وجہ سے ہماری تہذیب کی بقا خطرے میں پڑ گئی ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ اس حقیقت سے تقریباً تمام وہ لوگ آشنا ہیں جو بین‌الاقوامی معاملات پر گہری نظر رکھتے ہیں ۔ اس کے باوجود قومی دولت کو ہر جگہ اس تباہ کن برائی کی اشاعت اور تقویت پر صرف کیا جا رہا ہے ۔ جو لوگ اس خیال کے ہیں کہ بچوں کو یہ نہ سکھایا جائے کہ وہ لوگوں کے قتلِ عام کو انسان کا بہترین عمل خیال کریں ، انہیں غدار اور اپنے ملک کے سوا باقی تمام ملکوں کا دوست بتا کر برا بھلا کہا جاتا ہے ۔ یہ خیال ہو سکتا تھا کہ چونکہ والدین کو بچوں سے قدرتی لگاؤ ہوتا ہے اس لیے انہیں یہ خیال دکھ دے گا کہ ان

کے بچے عذاب میں مبتلا ہو کر مریں ، لیکن صورت حال یہ نہیں ہے ۔ اگرچہ خطرہ یقینی ہے لیکن اکثر ممالک میں اقتدار کے مالک ان تمام کوششوں کو جو اس خطرے کی روک تھام کے لیے کی جا رہی ہیں ، ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ فوجی ملازمت کو اپنے ملک کی حفاظت کے لیے ''شریف ترین اہتمام'' کہا جاتا ہے اور نوجوانوں کو اس امر سے آگاہ کرنے کے لیے ایک لفظ نہیں کہا جاتا کہ اگر ان کا ملک طاقتور ہے تو فوجی اقدامات دفاع ملک کے بجائے زیادہ تر دوسرے ممالک کے خلاف جارحانہ اقدامات ہی ہوں گے ۔

حب وطن کی تعلیم کے خلاف کئی اعتراض ہیں ؛ پہلا اعتراض تو وہی ہے جس پر ہم ابھی بحث کر چکے ہیں ، یعنی جب تک جذبۂ قومیت کا زہر کم نہ ہوگا اس وقت تک تمدن کی بقا کی کوئی صورت نہیں ۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جن اداروں میں لوگوں کو انسانوں کے قتل کی تعلیم دی جا رہی ہو ، وہاں انہیں مہذب انسانی نصب العین کی تعلیم دینا بے حد دشوار ہے ۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ نفرت کی تعلیم جو جذبۂ قومیت کا ایک ضروری حصہ ہے ، بذاتِ خود ایک بری چیز ہے ۔ لیکن ان اعتراضات کے علاوہ اس تعلیم کے خلاف ایک خالص عقلی اعتراض بھی ہے ، یعنی قومیت کی تعلیم کئی بے سروپا باتوں پر مشتمل ہوتی ہے ۔ دنیا کے ہر ملک میں بچوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ ان کا ملک بہترین ملک ہے ۔ اور سوائے ایک ملک کے باقی ممالک میں یہ

بات غلط ہے ۔ چونکہ مختلف اقوام اس امر پر متفق نہیں ہو سکتیں کہ وہ کون سا ملک ہے جس کے متعلق یہ بات درست ہے اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ دوسری اقوام کی تذلیل کر کے اپنی قوم کی خوبیوں پر زور دینے کی عادت کو چھوڑ دیا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خیال سرے سے مفسدانہ اور بعض صورتوں میں خلاف قانون سمجھا جاتا ہے کہ بچوں کو جو کچھ پڑھایا جائے وہ امکانی حد تک درست ہونا چاہیے ، لیکن پھر بھی میرا عقیدہ یہی ہے کہ جھوٹ سکھانے سے سچ سکھانا بہتر ہے ۔ تاریخ تمام ممالک میں ایک ہی طرح پڑھائی جانی چاہیے اور نصاب کی تاریخی کتابیں مجلس اقوام کی نگرانی میں لکھوائی جانی چاہییں جس کے لیے ریاست ہائے متحدۂ امریکہ اور روس سے ایک ایک معاون کی خدمات حاصل کی جائیں ۔ تاریخ کو عالمی تاریخ ہونا چاہیے نہ کہ قومی تاریخ اور اسے جنگوں کے بجائے ثقافتی اہمیت کے معاملات پر زور دینا چاہیے ۔ جس حد تک لڑائیوں کا پڑھانا ضروری ہو وہ صرف فاتحانہ اور دلیرانہ کارناموں کے زاویۂ نگاہ سے نہ پڑھائی جائیں ۔ طالب علم میدان جنگ میں زخمی سپاہیوں کے درمیان ٹھہریں اور انھیں غیرآباد علاقوں میں بے گھر لوگوں کی حالت زار کا احساس دلایا جائے اور نیز انھیں ان تمام مظالم اور بے انصافیوں سے آگاہ کیا جانا چاہیے جن کے مناظر لڑائی میں نظر آتے ہیں ۔ موجودہ حالت میں تقریباً تمام تعلیم جنگ کی عظمت نمایاں کرنے والی ہے ۔ مدارس کی

تعلیم کے مقابلے میں صلح کل جماعت کی تمام مساعی بے اثر ہیں ۔ یہ حالت بالخصوص ان مدارس کی ہے جو امراء کے بچوں کے لیے مخصوص ہیں اور جو ہر جگہ ذہنی اور اخلاق لحاظ سے غرباء کے مدارس کے مقابلے میں پست تر ہیں ۔ بچوں کو مدارس میں دوسری اقوام کے نقائص تو بتا دیے جاتے ہیں لیکن اپنی قوم کے نقائص نہیں بتائے جاتے ۔ دوسری اقوام کے نقائص جاننے سے انسان میں اپنے آپ کو حق پر سمجھنے اور جنگجو بننے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں ، حالانکہ اپنے عیوب سے باخبر رهنا مفید ہوتا ہے ۔ کون سے انگریز بچوں کو مدارس میں آئرلینڈ کے بلیک اینڈ ٹینز (Black and Tans) کے واقعات کے متعلق سچ بتایا جاتا ہے ؟ کون سے فرانسیسی بچوں کو سیاہ افواج کے قبضۂ روھر کے بارے میں سچائی بتائی جاتی ہے ؟ کون سے امریکی لڑکے کو ساکو (Sacco) اور ونزٹی (Vanzetti) کے متعلق یا مونی (Mooney) اور بلنگز (Billings) کے بارے میں صحیح واقعات بتائے جاتے ہیں ؟ انھی نظراندازیوں کی وجہ سے ہر مہذب ملک کا ایک عام شہری خود فریبی میں پھنسا رہتا ہے ، وہ باقی اقوام کے متعلق ان تمام امور سے با خبر ہوتا ہے جو خود انہیں معلوم نہیں ہوتے اور اسے ان باتوں کی خبر نہیں ہوتی جو دوسری قومیں اپنے ملک کے متعلق جانتی ہیں ۔

حب وطن کی تعلیم کا اکثر حصہ گو عقلی طور پر غلط ہے تاہم اخلاق لحاظ سے اس کی حیثیت بے ضرر

ہے - جو لوگ پڑھاتے ہیں خود انہیں غلط طریقے پر تعلیم دی گئی تھی؛ چنانچہ وہ یہ محسوس کرنا سیکھ گئے ہیں کہ جس دنیا میں دوسرے ممالک کے لوگ ایسے برے ہیں وہاں عظیم فوجی مساعی ہی ان کے ملک کو تباہی سے بچا سکتی ہیں - بہر حال حبِ وطن کے اس پروپیگنڈے کا ایک اور کم بے ضرر پہلو بھی ہے - کچھ مفاد ایسے ہیں جو اس پروپیگنڈے سے زر اندوزی کا کام لیتے ہیں - صرف اسلحہ سازی کے مفاد ہی نہیں بلکہ وہ مفاد بھی جنہوں نے پسماندہ ملکوں میں روپیہ لگا رکھا ہے ؛ مثلاً اگر تم کسی غیر منظم ملک میں تیل کے مالک ہو تو تیل نکالنے کے اخراجات کے دو حصے ہوں گے — اول فنی یعنی تیل نکالنے کے سیدھے سادے مصارف ، دوم سیاسی یا فوجی — یعنی باشندگانِ ملک کو قابو میں رکھنے کے اخراجات - تمہیں ان اخراجات کا صرف پہلا حصہ ہی برداشت کرنا ہوگا ، اخراجات کا دوسرا حصہ جو ممکن ہے بہت زیادہ ہو ، ٹیکس ادا کرنے والوں پر پڑے گا جنہیں حبِ وطن کے پروپیگنڈے کے زور سے یہ بوجھ اٹھانے پر آمادہ کیا جائے گا - اس طریقے سے حبِ وطن اور مالیات میں ایک نہایت نا مناسب رابطہ قائم ہو جاتا ہے ، یہ ایک مزید حقیقت ہے جس کو نوجوانوں سے نہایت احتیاط کے ساتھ چھپایا جاتا ہے -

حبِ وطن کا جذبہ اپنی تمام جنگجویانہ شکلوں میں روپے پیسے کے ساتھ نہایت گہرے روابط رکھتا ہے -

حکومت کی مسلح افواج اھلِ ملک کو دولت مند بنانے کے لیے استعمال کی جاتی ھیں یا کی جا سکتی ھیں ۔ اس چیز کی تکمیل کچھ تو خراج اور تاوان کی وصولی سے کی جاتی ھے ، کچھ ان قرضوں کی ادائیگی پر اصرار کرنے سے جو رد کیے جا سکتے تھے ، کچھ اجناسِ خام پر قبضہ کرنے سے اور کچھ جبری تجارتی معاھدوں سے ۔ اگر اس تمام طریق کار کو جذبۂ قومیت کے نظر فریب حسن نے چھپا نہ دیا ھوتا تو تمام معقول انسانوں پر اس کی بے ھودگی اور برائی واضح ھو جاتی ۔ اگر آپ چاھیں تو تعلیم آسانی سے لوگوں میں انسانی نسل کے استحکام اور بین الاقوامی تعاون کا احساس پیدا کر سکتی ھے ۔ ایک ھی نسل کے اندر اندر اس تیز و تند جذبۂ قومیت کی آگ کو بجھایا جا سکتا ھے جس سے دنیا تکلیف میں مبتلا ھے ، ایک ھی نسل کے اندر اندر اس جذبے کی دیواروں کو جو ھمیں روز بروز مفلس بنا رھی ھیں پست کیا جا سکتا ھے ۔ جنگی تیاریاں جن سے ھم اپنے آپ کو موت کے خطرے میں مبتلا کر رھے ھیں ، ختم کی جا سکتی ھیں اور وہ خبثِ باطن جس سے ھم خود اپنی ناک آپ کاٹ رھے ھیں ، جذباتِ خیر سگالی میں بدل سکتا ھے ۔ جذبۂ قومیت جو اس وقت ھر طرف چھایا ھوا ھے ، زیادہ تر مدرسوں کی پیداوار ھے اور اگر اس کو ختم کرنا ھے تو ھمیں تعلیم میں نئی روح پھونکنا ھوگی ۔

یہ معاملہ بھی تخفیفِ اسلحہ کی طرح بین الاقوامی

سمجھوتے سے طے کرنا پڑے گا۔ مجلس اقوام کو اگر کبھی چیرہ دست اقوام کے اعمال کی لیپ پوت سے فراغت مل گئی تو شاید وہ جلد یا بدیر معاملے کی اہمیت سے آگاہ ہو جائے۔ ممکن ہے حکومتیں تاریخ کی ایک سی تعلیم پر راضی ہو جائیں، ممکن ہے اگلی جنگ عظیم کے بقیۃ السیف لوگ، بشرطیکہ کوئی زندہ بچ سکا، جمع ہو کر فیصلہ کریں کہ متعدد قومی جھنڈوں کی جگہ بین الاقوامی جھنڈے کو دے دی جائے، لیکن بلا شبہ یہ باتیں شیخ چلی کے خواب ہیں۔ یہ استادوں کی فطرت ہے کہ جو کچھ وہ جانتے ہیں وہی سکھاتے ہیں، خواہ یہ علم کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ فرض کیجیے کہ تاریخ کے انگریز استادوں کو ایک ایسے بین الاقوامی معاہدے کا خطرہ در پیش ہے جس کے ماتحت عالمی تاریخ کا پڑھانا ضروری ہوگا۔ ایسی حالت میں انھیں سن ہجری اور فتح قسطنطنیہ کی تاریخ بھی معلوم کرنی ہوگی۔ اسی طرح چنگیز خاں اور آئیوان مہیب (Ivan the Terrible) کے حالات جاننا پڑیں گے اور یہ بھی کہ جہاز رانوں کا قطب نما چین سے نکل کر عرب ملاحوں کے پاس کیوں کر پہنچا اور یہ کہ سب سے پہلے یونانیوں نے مہاتما بدھ کے مجسمے بنائے۔ جب ان کے اوقات سے ایسے تقاضے کیے جائیں گے تو ان کی برھمی کی کوئی حد نہیں رہے گی اور وہ ایک ایسی نئی حکومت کے لیے جد و جہد شروع کر دیں گے جو مجلس اقوام کے احکام کی خلاف ورزی کا حلف اٹھا لے۔ ہمارے عہد میں تمام

مغربی دنیا کا سارا عملی زور سرمایہ دارانہ مہموں پر صرف ہو رہا ہے اور مجموعی طور پر یہ ایسی طاقت ہے جو تباہی کی طرف لیے جا رہی ہے۔ انسانوں کی وہ جماعتیں جو اچھے کام کر سکتی ہیں۔ مثلاً مدارس کے اساتذہ ان کی ایک معتد بہ تعداد حالت موجودہ پر قانع ہے۔ اگر سماج میں کوئی اصلاح کی جائے گی تو اس سے ان کے اسباق میں بھی تبدیلی لازمی ہو جائے گی، اس لیے جہاں تک ممکن ہو وہ اس سے بچنا ضروری سمجھیں گے۔ جس کوشش سے وہ بچنا چاہتے ہیں اس کی حیثیت صرف عقلی نہیں بلکہ جذباتی بھی ہے۔ جانے پہچانے جذبات آسانی سے پیدا ہو جاتے ہیں اور ایک جانے پہچانے موقع پر (مثلاً قومی ترانے کے گائے جانے کے وقت)، اپنے آپ کو نئے قسم کے جذبات پیدا کرنے کا ڈھب سکھانا مشکل ہے۔ اس طور پر ہماری موجودہ دنیا جہاں نیک آدمی کاہل ہیں اور صرف برے لوگ سرگرم عمل، بدمستی کے عالم میں چکر کھاتی ہوئی تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ بعض اوقات لوگ تباہی کے غار کو دیکھ لیتے ہیں، لیکن غیر حقیقی جذبات کا نشہ جلد ان کی آنکھوں کو بند کر دیتا ہے؛ جو لوگ نشے کی حالت میں نہیں ہیں ان کے لیے خطرہ بالکل واضح ہے۔ جذبۂ قومیت ہی وہ بڑی طاقت ہے جو ہماری تہذیب کو تباہی کی طرف دھکیل رہی ہے۔

(نوٹ) انگلستان کے سرکاری مدارس میں جذبۂ قومیت کا اندازہ مس بیرل ایلوارڈ (Miss Beryl Aylward)

کی مثال سے لگایا جا سکتا ہے جیسے کوونٹری (Coventry) کے سکول سے اس لیے موقوف کر دیا گیا کہ اس نے اسپائر ڈے کے موقع پر قومی جھنڈے کو سلامی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ چونکہ وہ کوئیکر جماعت سے ہے اس لیے وہ خود اپنے ملک کی قصیدہ خوانی کو بین الاقوامی جذبۂ خیر سگالی کا ممد نہیں خیال کرتی؛ لہذا ظاہر ہے کہ کوئی باضمیر کوئیکر یا صلح کل انسان انگلستان کے کسی سرکاری مدرسے میں مدرس کی اسامی پر نہیں رہ سکتا۔

باب یازدہم

تعلیم میں طبقاتی احساس کا مقام

ابتدائے تمدن سے لے کر آج تک طبقاتی عدم مساوات موجود رہی ہے ۔ اس وقت وحشی قبائل میں اس کی صورت بہت سادہ ہے ۔ ان قبائل کے سردار ہیں جو کئی بیویاں رکھ سکتے ہیں ۔ وحشیوں نے مہذب لوگوں کے برعکس بیویوں کو دولت کمانے کا ذریعہ بنانا سیکھ رکھا ہے ، اس لیے جس آدمی کی جتنی زیادہ بیویاں ہوں گی وہ اتنا ہی دولت مند ہوگا ، لیکن سماجی عدم مساوات کی اس سادہ صورت نے جلد ہی زیادہ پیچیدہ صورت اختیار کر لی ، زیادہ تر سماجی عدم مساوات وراثت سے وابستہ رہی ہے اس لیے تمام سرقبیلی معاشروں میں اس کا تعلق مرد کی وراثت سے رہا ہے ۔ اول اول بعض اشخاص کی بڑی دولت ان کی فوجی قوت کا نتیجہ تھی ۔ ایک کامیاب جنگ جو آدمی دولت جمع کر لیتا اور اپنے بیٹوں میں منتقل کر دیتا ۔ جو دولت تلوار سے حاصل کی جاتی تھی وہ زیادہ تر زمین کی شکل میں ہوتی تھی اور آج تک زمینداری اشرافیت کا امتیازی نشان سمجھی جاتی ہے ۔ نظری طور پر اشراف کو جاگیردار کا جانشین سمجھا جاتا ہے جس نے پہلے مالک کو قتل کر کے زمین پر قبضہ کر لیا اور

پھر اسے تمام بعد کے آدمیوں کے قبضے سے بچائے رکھا، اسے دولت کمانے کا شریف ترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے؛ کچھ کمتر شریف ذرائع بھی ہیں؛ مثلاً وہ لوگ جو بالکل کاھل ہیں لیکن انھیں کسی محنتی بزرگ سے دولت وراثت میں مل گئی ہے؛ نیز کچھ اور اس سے بھی زیادہ کم مرتبہ ہیں مثلاً جنھوں نے اپنی محنت سے دولت کمائی ہے۔ عہد حاضر میں وہ دولت مند جو امیر ہونے کے باوجود محنت کرتا ہے، آہستہ آہستہ اِن خاندانی دولت مندوں کو میدان سے باھر نکال رہا ہے جن کی آمدنی کا مدار نظری طور پر زیادہ تر زمینداری اور قدرتی اجارہ داریوں پر ہے۔ جائداد کے دو بڑے قانونی ذریعے رہے ہیں؛ اول زمین کی ملکیت کا اشراقی ذریعہ اور دوم شہری متوسط طبقے کا ذریعہ، یعنی اپنی محنت کی پیداوار کا حق۔ اپنی اپنی مشقت کی پیداوار پر انسان کا حق ہمیشہ کاغذ پر موجودہ رہا ہے کیونکہ چیزیں دوسری چیزوں سے بنائی جاتی ہیں، اس لیے جو آدمی خام اجناس مہیا کرتا ہے وہ اپنی محنت کے عوض صرف مزدوری کی شکل میں تیار شدہ اشیاء کا حق دار ہو سکتا ہے، یا جہاں غلامی کی رسم موجود ہے، وہاں وہ زندگی کی کم از کم ضرورتوں کی بہم رسانی کی شکل میں معاوضہ پاتا ہے۔ اس لحاظ سے انسانوں کے تین گروہ ہیں، یعنی مالکان زمین، سرمایہ دار اور عوام۔ سرمایہ دار در اصل وہ آدمی ہے جسے اس کی پس اندازی نے اس قابل بنا دیا ہے کہ تمام مواد خام اور تمام وہ اوزار خرید لے جو صنعت کے لیے

ضروری ہیں اور اس طرح مزدوری ادا کر کے مکمل مصنوعات کا حق دار بن جائے۔ نظری طور پر یہ تینوں جماعتیں، یعنی مالکان زمین، سرمایہ دار اور مزدور ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن عملی طور پر یہ فرق دھندلا پڑ جاتا ہے۔ ایک زمیندار سمندر کے کنارے ایک صحت افزا مقام کو جو اس کی اپنی زمین پر واقع ہے، ترقی دینے کے لیے تجارتی طریقے استعمال کر سکتا ہے۔ ایک سرمایہ دار جس نے صنعت و حرفت سے روپیہ کمایا ہے، اپنے تمام سرمائے یا اس کے کچھ حصے کو زمین میں لگا سکتا ہے اور اس کی آمدنی پر گزارا کر سکتا ہے۔ ایک مزدور جس حد تک کہ اس کا روپیہ بنک میں جمع ہے، یا وہ اقساط پر ایک مکان خرید رہا ہے، اس حد تک وہ سرمایہ دار یا زمیندار بن جاتا ہے۔ ایک مشہور بیرسٹر جو ایک مقدمے کا ہزار گنی محنتانہ وصول کرتا ہے، کڑے اصول اقتصادیات کے ماتحت محنت کشوں میں شمار ہوگا لیکن اگر آپ ایسا کہہ بیٹھیں تو وہ ناراض ہو جائے گا اور اس کی ذہنیت دولت مندوں کی سی ہوگی۔

عملی زاویۂ نگاہ سے اس کے سوا باقی ممالک میں جماعتی امتیاز کا مدار سر قبیلی خاندان اور رسم وراثت پر ہے۔ سر قبیلی خاندان کے طفیل امرا کے بچوں کو غربا کے بچوں سے مختلف تعلیم دی جاتی ہے، گو یہ ضروری نہیں کہ وہ بہتر بھی ہو۔ رسم وراثت کی وجہ سے دولت مندوں کے بچے اگر چاہیں تو بیکار رہنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں کیوں کہ وہ بھوکوں نہیں مر سکتے۔ اگر وراثت باقی نہ

رہے تو دولت کی جو کچھ عدم مساوات باقی ہو وہ ہر نسل میں ختم ہو جایا کرے اور اگر سرقبیلی خاندان نہ رہے تو امرا کے بچوں کو غریب بچوں سے مختلف تعلیم نہ دی جائے۔ اشتراکی سرمایہ دارانہ نظام کے متعلق مبہم باتیں کہنے کے عادی ہیں، وہ ان مختلف عناصر کا جو اس نظام میں معاون ہیں، مناسب تجزیہ نہیں کرتے۔ سرمایہ داروں کی تجارتی سرگرمیاں ہی سارا سرمایہ دارانہ نظام نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سرمایہ دار کی دولت کی وجہ سے اس کے بچوں کو بھی ممتاز حیثیت مل جاتی ہے اور یہ حقیقت اس نظام کا لازمی حصہ ہے۔ اس سے میرا مقصد مارکس کے نظریے پر تنقید کرنا نہیں، کیوں کہ مارکس کو اقتصادیات اور خاندان کے باہمی تعلق کا علم تھا، بلکہ اس سے میرا مقصد اکثر ایسے انگریزی بولنے والے اشتراکیوں پر تنقید کرنا ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ معاشرے کے اقتصادی ڈھانچے کا شادی اور خاندان سے کوئی گہرا ربط نہیں۔ در اصل یہ تعلق دو طرفہ ہے، متوسط طبقے کا جو سرمایہ دار ذاتی جائداد جمع کرنے میں مصروف رہتا ہے، وہ ذاتی جائداد کے اصول کا اطلاق بیوی اور بچوں پر بھی کرتا ہے اور اسی لیے اس کے متعلق اس کے احساسات ایک خاص نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جنسی رقابت اور پدری محبت ہی وہ جذبات ہیں جو مردوں میں بیوی بچوں کو ذاتی جائداد سمجھنے کی خواہش پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ ذاتی جائداد کی اس قسم کی خواہش سے دوسری صورتوں کی خواہش بھی پیدا ہوتے

لگتی ہے۔ ایک ابتدائی معاشرے میں ممکن ہے کہ ایک آدمی زیادہ دولت کی تمنا زیادہ بیویوں کے لیے کرے۔ ایک مہذب قوم میں دولت مند ہونے کی خواہش کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنے بیوی بچوں کا سماجی مقام مزدوروں کے بیوی بچوں کے مقابلے میں بلند رکھ سکے، اس لیے مادی اشیاء کے ذاتی جائداد اور بیوی بچوں کے ذاتی جائداد ہونے میں دوطرفہ تعلق پایا جاتا ہے۔ یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ ایک کا خاتمہ دوسرے کے بغیر ممکن ہے۔ بیوی بچوں کو ذاتی جائداد سمجھنے سے ان کے متعلق جذبۂ رقابت پیدا ہو جاتا ہے اور اسی لیے تعلیم میں جماعتی امتیاز کا ایک محرک پیدا ہو جاتا ہے۔ میں اس مقام پر اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا کہ ایک مکمل نظام اشتمالیت سے یہ تمام معاملات کس طرح متاثر ہوں گے۔

تعلیم کے معاملے میں بلاشبہ باپ کی سماجی حیثیت ہی اولاد کی سماجی حیثیت کو معین کرتی ہے؛ پس جس معاشرے میں جماعتی امتیازات موجود ہوں اس میں بچوں کا احترام محض ان کے ذاتی اوصاف کی بنا پر نہیں بلکہ ان کے باپ کی دولت کی بنا پر بھی کیا جاتا ہے۔ امرا کے بچوں کو یہ یقین ہوجاتا ہے کہ وہ غربا کے بچوں کے مقابلے میں بہتر ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ غربا کے بچے خود کو امرا کے بچوں سے پست تر سمجھنے لگیں۔ غریبوں کے بچوں کے بارے میں یہ کوشش اس لیے ضروری ہوتی ہے کہ کہیں وہ ان ۔ انصافیوں کے خلاف جن کا وہ شکار ہو رہے ہیں، اظہار نفرت نہ کرنے لگیں۔ اس کا نتیجہ

یہ ہے کہ جہاں بھی جماعتی امتیاز موجود ہے وہاں نظام تعلیم میں یہ دو متلازم نقائص بھی موجود ہوتے ہیں ، یعنی امرا میں غرور کا پیدا ہونا اور غریبوں میں نامعقول قسم کا انکسار پیدا کرنے کی کوشش ۔ امرا کے غرور کے خلاف اعتراضات واضح ہیں اور انبیاے بنی اسرائیل سے لے کر اب تک تمام معلمین اخلاق انہیں ظاہر کرتے چلے آئے ہیں ، گو بہت کم معلمین اخلاق یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس برائی کا خاتمہ خالی تبلیغ سے نہیں بلکہ صرف ایک مختلف قسم کے معاشی نظام ہی سے ہو سکتا ہے ۔ غریبوں میں نامعقول انکسار پیدا کرنے کی خرابیاں کچھ مختلف ہیں ۔ اگر یہ پیدا ہو جائے تو قوت اختراع اور جذبۂ خود حرمتی بری طرح کمزور ہو جاتے ہیں اور اگر یہ پیدا نہ ہو تو آزردگی رونما ہوگی جو تباہی کا باعث ہوگی ۔ یہ انکسار پیدا ہو یا نہ ہو مگر اسے پیدا کرنے کی کوشش کرنا جھوٹ کی تعلیم دینے کے مرادف ہے ۔ یہ اخلاق جھوٹ ہوگا کیونکہ یہ حقائق کو اس رنگ میں پیش کرے گا کہ امیر اور غریب کی عدم مساوات کوئی بے انصافی نہیں ۔ یہ اقتصادی جھوٹ بھی ہوگا کیوں کہ بظاہر یہ خیال کیا جائے گا کہ موجودہ اقتصادی نظام ہر ممکن لحاظ سے بہترین نظام ہے ۔ یہ تاریخی جھوٹ بھی ہوگا اس لیے کہ امیروں اور غریبوں کے سابق باہمی جھگڑے امیروں کے زاویے سے بیان کیے جائیں گے ۔ جب مدرسین خود محنت کشوں سے چنداں بہتر نہ ہوں تو جو کچھ انہیں پڑھانا ہے اس کو صحیح یقین کرنے کے لیے

ان کی روحوں کا غلامانہ ہونا ضروری ہوگا اور اگر وہ یقین کیے بغیر بڑھانا چاہیں گے تو گویا بزدل ہوں گے ۔

دور صنعت سے قبل کے معاشروں میں جہاں دولت عام طور پر اشراف کے قبضے میں ہوتی ہے ، عدم‌مساوات کا دفاع احترام نسب کی صورت اختیار کرتا ہے جو اکثر احترام دولت پر فوقیت حاصل کر لیتا ہے اور اس جذبے کی اقتصادی اصل کو چھپا دیتا ہے ۔ ایک قلاش جلا وطن سردار قبیلہ ایک کامیاب ساہوکار سے زیادہ قابل‌عزت شمار ہوگا ۔ اس کے باوجود بنیادی طور پر دولت ہی ہے جس کا احترام کیا جاتا ہے ، کیوں کہ عام طور پر ایسے معاشروں میں اشرافی نسب ہی سرچشمۂ دولت ہوتا ہے اور جس جگہ اشرافیت قوی ہو وہاں ان کی عظمت کے اعتقاد کو ہر طرح کی خرافات سے سہارا دیا جاتا ہے ، مثلاً یہ کہ امرا کے اطوار نسبتاً بہتر ہوتے ہیں ، وہ زیادہ تعلیم یافتہ اور عوام کے مقابلے میں لطیف الاحساس ہوتے ہیں ۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں حکومت دولت مندوں کے ہاتھوں میں ہو ، جیسا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہے ، وہاں اس لغویت کی ایک اور صورت ہے ۔ ایک کامیاب دولت مند کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے موجودہ حیثیت محنت ، کفایت شعاری اور انتہائی دیانت داری سے حاصل کی ہے ۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو قومی امانت کے طور پر استعمال کرتا ہے اور اس کی نگاہ ہمیشہ عوامی بھلائی پر رہتی ہے ۔ گزشتہ صدی کے چھٹے اور ساتویں عشرے میں جب دھاتیوں میں

کروڑپتیوں کی کثیر دولت ایک اچنبھا تھی ، اس دور کی روایاتی ثقافت کے علمبرداروں مثلاً ایڈمز[1] کے خاندان نے نہایت جوش و خروش سے ان حیلوں ، مکاریوں اور خلاف قانون حرکتوں کو بے نقاب کیا جن کی بدولت اکثر چوٹی کے کروڑپتیوں نے دولت جمع کی تھی ۔ گزشتہ صدی کے آٹھویں اور نویں عشرے میں سٹینڈرڈ آئل کمپنی کے طور طریقوں کے خلاف کتابیں لکھی جاتی رہیں ، اب یہ سب کچھ بدل چکا ہے؛ اس وقت بڑے بڑے کروڑ پتی عوام کے بہت بڑے خیراندیش سمجھے جاتے ہیں ، ہر یونیورسٹی کو ان کے یہاں سے عطیے مل رہے ہیں یا ملنے کی توقع ہے ۔ علمی مذاق کے ہر نوجوان کو ان انسانیت دوست کروڑپتیوں کی سخاوت کے طفیل تحقیقاتی وظائف ملنے کی امید لگی رہتی ہے ۔ یونیورسٹیاں اور اخبارات بہت بڑے امیروں کی تعریف میں لگے رہتے ہیں اور عوام کو یہ عقیدہ سکھایا جاتا ہے کہ نیکی اور آمدنی میں باہمی نسبت ہے ۔ پس ریاست ہائے متحدہ امریکہ جیسے ملک میں بھی جماعتی امتیاز اتنا ہی اہم ہے جتنا کسی اشرافی ملک میں ، لیکن ناروے اور ڈنمارک جیسے ممالک سے کافی زیادہ اہم، جہاں آسودگی کافی عام ہے اور بہت زیادہ دولت تقریباً ناپید ہے ۔

جماعتی امتیاز کے نقصانات صرف بچوں ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان کا اثر استاد اور نصاب تعلیم تک پہنچتا

---

۱ ۔ دیکھو کتاب :
"High Finance in the Sixties" by Brothers Adams.

ہے ۔ جسمانی تربیت کے بجائے ذہنی تربیت کو زیادہ وقعت حاصل ہے ، اس لیے جو استاد ذہنی تربیت کا ذمہ دار ہوتا ہے عام طور پر جسمانی صحت کی طرف سے بے نیاز اور ان علامات سے ناواقف رہتا ہے جن سے بیماری کے آغاز کا پتا چل سکتا ہے ۔ جسم اور روح کی تفریق محض بناوٹی اور غیر حقیقی ہے لیکن بد قسمتی سے ہماری سماج کا تدریجی نظام اس سے متاثر ہوا ہے اور نتیجۃً تعلیم میں روح اور جسم کی حفاظت کو غیرضروری طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا ہے ، لیکن بہر حال اب حالت اتنی بری نہیں جتنی پہلے تھی ۔ جب ایک بہرے لڑکے کو سالہا سال تک بے توجہی کے جرم میں پیٹا جاتا تھا اور کسی استاد کو بھی یہ معلوم نہ ہونے پاتا تھا کہ وہ بہرا ہے ، اگرچہ اس زمانے میں ایسی انتہائی مثالوں کے وقوع کا احتمال نہیں ، تاہم یہ قباحت کچھ کم شدید صورت میں اب بھی موجود ہے ، مثلاً استاد کو لڑکے کی قوت ہاضمہ کے متعلق کچھ علم نہیں ہوتا اور ممکن ہے وہ بچے کی کم‌فہمی یا بدمزاجی سے برافروختہ ہو جائے حالاں کہ ان کی اصل وجہ قبض کی شکایت ہو ۔ اگر یہ تجویز کیا جائے کہ اساتذہ طالب‌علموں کی انتڑیوں کے عمل کی طرف بھی خیال رکھا کریں تو ان کا جذبۂ خود نمائی اسے اپنی توہین خیال کرے گا ۔ میں نہیں چاہتا کہ قارئین اس معاملے میں کسی غلط فہمی میں پڑ جائیں ۔ اس سے انکار نہیں کہ تمام جدید مدارس میں بچوں کی جسمانی صحت کا خیال رکھا جاتا ہے اور ان کی تندرستی کے لیے پرانے زمانے کے مقابلے

میں بہت کچھ کیا جاتا ہے ۔ مجھے شکایت یہ ہے کہ جسمانی اور دماغی تربیت کو اس طرح مکمل طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا ہے کہ جس انسان کو ایک پہلو کا علم ہوتا ہے عام طور پر اسے دوسرے پہلو سے مس تک نہیں ہوتا ۔ ایک بالغ آدمی کے جسم اور دماغ میں بہت بڑی خلیج حائل ہوتی ہے لیکن اس خلیج کا کوئی ما بعدالطبیعیاتی لزوم نہیں ، بلکہ یہ تعلیم کی پیداوار ہے ۔ ایک ننھے بچے کی صورت میں یہ خلیج بالکل نہیں ہوتی ۔ ذرا بڑی عمر کے بچے میں بہت تھوڑی ہوتی ہے اور بچے میں بھی زیادہ نہیں ہوتی ۔ میرے خیال میں دس سال کا ایک لڑکا دماغی اور جسمانی امتیاز کی بہت عمدہ فلسفیانہ تشریح نہ کر سکے گا ، لیکن اگر تم یہ کہو کہ دماغ اس حصے کا نام ہے جس کی نگرانی مس الف کر رہی ہے اور جسم اس حصے کا جس کی حفاظت کرنا مس ب کا کام ہے تو ہر لڑکا فوراً یہ بات سمجھ جائے گا ۔ یہ مس الف اور ب کی تفریق ہی ہے جو جسم و دماغ کے ما بعدالطبیعیاتی امتیاز کی اساس ہے ۔ اگر مس الف اور ب کے فرائض مس ج کی ذات میں جمع کر دیے جاتے تو سب لڑکے جوان ہو کر غیر جانب دار وحدت‌پرست بنتے اور ان کا عقیدہ یہ ہوتا کہ دل اور مادہ ایک ہی قدرتی کرشمے کے دو مختلف پہلو ہیں؛ اس لحاظ سے ما بعد الطبیعیات کا تعلق جماعتی نظام سے ہے ۔ دماغی سرگرمی اس عمل کا نام ہے جس میں ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پڑیں ؛ اس کے برعکس جسمانی عمل وہ ہے جس میں ہاتھ پاؤں ہلانے پڑیں ۔ دماغی عمل

جسمانی عمل کے مقابلے میں بلند مرتبہ ہے کیوں کہ جو لوگ صرف دماغی کام کرتے ہیں وہ جسمانی مشقت کا کام کرانے کے لیے نوکر رکھتے ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ روح جسم سے افضل ہے اور مادہ بری چیز ہے وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک نصاب تعلیم کا تعلق ہے، احترام دولت کا اثر اس پر بھی پڑا، اگرچہ یہ اثر پہلے کے مقابلے میں کم واضح ہے۔ ان تمام اقوام کی طرح جو غلاموں سے خدمت لیتی ہیں، یونانیوں کا خیال تھا کہ ہاتھوں سے کام کرنا گنواروں کا کام ہے۔ اسی لیے انھوں نے ثقافت، فلسفہ، خطابت و بلاغت اور تمام ان کاموں پر جو ہاتھوں کو استعمال کیے بغیر کیے جا سکتے ہیں، زیادہ زور دیا۔ ان کے خیال کا رخ یہ تھا کہ ہر قسم کی دستکاری شریف آدمی کی شان کے خلاف ہے اور غالباً تجرباتی سائنس میں ان کی جزوی ناکامیابی کی کچھ وجہ یہ بھی تھی۔ ارشمیدس نے محاصرہ سراکوز (Syracuse) کے دوران میں جو عجیب و غریب ایجادیں کی تھیں ان کا ذکر کرتے ہوئے پلوٹارک (Plutarch) اسے گنوارپن کے الزام سے اس بنا پر بری قرار دیتا ہے کہ اس نے یہ کام اپنے چچیرے بھائی کی فائدہ رسانی کے لیے کیا تھا جو بادشاہ تھا۔ اہل روما کو یونانیوں کا نظریۂ ثقافت وراثت میں ملا تھا اور مغربی یورپ کے تمام ممالک میں آج تک اسی خیال کا بول بالا رہا۔ ثقافت ایک ایسی چیز ہے جو مطالعۂ کتب اور گفتگو سے حاصل ہوتی ہے۔ جس چیز میں اس سے زیادہ

کی ضرورت پیش آئے ، وہ یونانیوں کے اصطلاحی معنوں کے مطابق ثقافت نہیں اور اس اصطلاح کا یونانی مفہوم ہی تا حال کم از کم انگلستان کے بیشتر مدرسین ، یونیورسٹی کے پروفیسروں اور تمام علمی مذاق کے بوڑھے لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے ۔ یہ بات صرف یونان اور روما کے عہد عتیق ہی کے متعلق درست نہیں بلکہ حالیہ تاریخ کے متعلق بھی ہنری کیونڈش (Henry Cavendish) اور رابرٹ بائل (Robert Boyle) کے مقابلے میں ہوریس والپول (Horace Walpole) اور بولنگ بروک (Boling brooke) کے حالات کا جاننا زیادہ ثقافت کی علامت سمجھا جاتا ہے ، حالانکہ دونوں اول الذکر آدمی زیادہ اہم انسان ہیں ۔ بالآخر اس سارے معاملے کا تعلق اس خیال سے ہے کہ شریف آدمی وہی ہے جو سوائے لڑائی کے فن شریف کے اور کسی کام میں ہاتھوں سے کام نہ لے ، ایک شریف آدمی تلوار کو تو استعمال کر سکتا ہے لیکن ٹائپ کی مشین کو نہیں ۔

اس طرح کے معاملات میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ تمام یورپ سے اس لیے بازی لے گیا ہے کہ وہاں نظام اشرافیت کا خاتمہ پوری شد و مد کے ساتھ اس وقت کیا گیا جب وہ یورپ کے تمام ممالک میں ابھی موجود تھا ، لیکن تعلیمی میدان میں ایک نئی قسم کی طبقاتی تفریق پیدا ہو رہی ہے ۔ یہ امتیاز تجارتی کاروبار کے نظم و نسق اور دستکاری کے ٹیکنیکل اعمال کے درمیان ہے ۔ جو شخص تجارتی کاروبار کے نظم و نسق میں مصروف ہے وہ مستقبل کا

اشراف ہے - جدید امریکہ میں بڑے منتظم کے وہی معنی ہیں جو ڈسرائیلی کے ناولوں میں " بڑے شریف آدمی " کے ہیں - " بڑے منتظم " کو " بڑے شریف آدمی " کی جگہ قابل تعریف نمونہ بنانے سے ثقافت کے نصب العین پر کافی اثر پڑ رہا ہے - ڈسرائیلی کے پر جوش فرضی منصوبوں کے مطابق " بڑا شریف آدمی " بلاشبہ ایک صاحب جبروت انسان تھا ، لیکن یہ اقتدار اسے بلا طلب ملا تھا اور وہ اسے قدرے کاہلی سے استعمال کرتا تھا ، نیز وہ بہت کافی دولت کا مالک بھی تھا جو اسے بغیر محنت کے ملی تھی اور بظاہر وہ اس کی زیادہ پروا نہ کرتا تھا - جن چیزوں پر اسے فخر تھا ان میں اس کا ملجھا ہوا اخلاق ، اچھی شراب کی پہچان ، مہذب ممالک کی دنیاے عظیم سے جان پہچان ، نشاۃ ثانیہ کی مصوری کے بارے میں اس کی رائے اور بذلہ گوئی کی صلاحیت شامل تھی - عمومی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اشراف کے کمالات زیادہ تر بے نتیجہ مگر بے ضرر تھے - ہمارے عہد کے بڑے منتظمین کے کمالات بہت مختلف ہیں ، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی موجودہ حیثیت زبردست قوت ارادی کے زور اور دوسرے لوگوں کا صحیح اندازہ لگانے کی استعداد سے حاصل کی ہے - اقتدار ان کا زبردست ترین جذبہ ہے اور نظم و نسق ان کی وہ فعالیت ہے جس میں انھیں دوسروں پر فوقیت حاصل ہے - یہ وہ لوگ ہیں جو بڑی سے بڑی نیکی یا بڑی سے بڑی برائی کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور جن کی قابلیت اور اہمیت کا احترام لازم ہے - ان کے کارناموں کی

ماھیت کی بنا پر ان سے محبت یا نفرت ھونی چاھیے لیکن کوئی شخص انھیں بے نیازی یا حقارت سے نہیں دیکھ سکتا۔ صنعتی دنیا میں اس قماش کے لوگ ضرور آگے آئیں گے۔ روس میں اس طرح کے لوگوں کو حکومت ایسے طریقے سے استعمال کرتی ھے کہ انھیں اپنی قابلیتیں آزمانے کا پورا موقع ملتا ھے ، لیکن اس بیدردانہ انفرادیت کو بروئے کار لانے کی اجازت نہیں دی جاتی جس کے وہ سرمایہ دارانہ ممالک میں مجرم ھوتے ھیں مگر سرمایہ داری ھو یا اشتمالیت ، صنعتی تمدن میں آخر کار ایسے لوگ ھی کامیاب ھو سکتے ھیں۔ زمانۂ قدیم کے اشرافوں اور ان کی ذھنیتوں میں جو فرق ھے اس کا صنعتی ثقافت کو جاگیر دارانہ اور تاجرانہ ثقافتوں سے مختلف بنانے میں بڑا اھم حصہ ھے۔

" شریفوں کی تعلیم " کے خیال کا یونیورسٹیوں پر برا اثر پڑا۔ وہ نوجوان جو غیر معمولی طور پر ذھین نہیں ھوتے انھیں اٹھارہ اور بائیس سال کی عمر کے درمیان ایسے ادبی علوم کی تحصیل کی طرف سنجیدگی سے توجہ کرنا مشکل نظر آتا ھے جو بعد میں براہ راست ان کے کسی کام نہیں آ سکتے ، اس لیے وہ یونیورسٹی میں کاھلی کی طرف مائل رھتے ھیں اور اگر کچھ کام کرتے بھی ھیں تو بے سوچے سمجھے لیکن دیانت سے کرتے ھیں۔ یونیورسٹیوں کا وجود ان لوگوں کے لیے جنھیں علمی تحقیقات ھی کو اپنا پیشہ بنانا ھے از بس غنیمت ھے ، لیکن اکثر باقی ماندہ لوگوں کے لیے وہ بعد کی زندگی سے قطعاً بے تعلق ھوتی ھیں۔ یونیورسٹی کا زمانہ ایسے علوم کی تحصیل میں صرف کرنا

ممکن ہے جنھیں کچھ پیشہ ورانہ افادیت حاصل ہے، لیکن قدامت پسند علمی ذوق کے لوگ اسے حد درجہ ناپسندیدگی سے دیکھتے ہیں، میرے خیال میں وہ غلطی پر ہیں۔ میرے نزدیک بہت سے سمجھ دار نوجوان اس احساس کی وجہ سے خشک اور بے کیف مزاج بن جاتے ہیں کہ جب تک وہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں ان کے کام کی کوئی حقیقی اہمیت نہیں۔ ایسی حالت ان لوگوں کو نہیں پیش آتی جو طب، انجینرنگ، زراعت یا اور کوئی ایسا ہی مضمون پڑھ رہے ہوں جس کی افادیت ظاہر ہو۔ ایک شریف آدمی کے بارے میں مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ مفید ہونے کے بجائے باعث زیبائش ہو، لیکن موزوں طور پر زیبائش کے لیے ضروری ہے کہ اسے ایسی آمدنی میسر ہو جس کے لیے اسے کام نہ کرنا پڑے۔ جن لوگوں کو اپنی روزی خود کمانا پڑے انھیں ایسی تعلیم دینے کی کوشش کرنا جس کا اصلی مقصد کاہلی کو پاکیزہ بنا کر دکھانا ہو دانش مندانہ فعل نہیں ہے۔ قوم کی زندگی میں خالص علمی نصب العین اپنا مقام رکھتا ہے لیکن صرف ان چند لوگوں کے لیے جو اپنی تمام قوتیں علمی تحقیقات کے لیے وقف کرنا چاہتے ہوں، لیکن جو لوگ کسی اور پیشے میں کھپ جانے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ وہ تعلیم کے آخری سال ایسے علوم و فنون کی تحصیل میں صرف کریں جن سے وہ اپنے پیشے کو پوری ذہانت اور وسعت نظر سے سر انجام دے سکیں۔ آج کل کسی ایسی چیز کا وجود نہیں جسے جامع تعلیم کہا جا سکے، لیکن انگلستان

میں بالخصوص یہ رجحان عام ہے کہ طالب علم میں ان عناصر کو اجاگر کر دیا جائے جن سے وہ گفتگو کرتے وقت فہیم و فریس معلوم ہو ، نیز اگر جامعہ میں حاصل کردہ علم ایسا ہے کہ بعد کی پیشہ ورانہ زندگی سے اسے کچھ لگاؤ نہیں تو یہ غالباً نذر فراموشی ہو جائے گا ۔ اگر چہل سالہ پیشہ ور لوگوں کا ان مضامین میں جو انھوں نے یونیورسٹی میں پڑھے تھے ، امتحان لیا جائے تو مجھے خوف ہے کہ اکثر حالتوں میں بہت تھوڑا علم باقی ہوگا ، لیکن اگر انھوں نے ایسے علوم کی تحصیل کی ہوتی جن سے وہ اپنے پیشوں کو قوم کی زندگی کی روشنی میں دیکھ سکتے اور اس کے مختلف معاشرتی پہلوؤں کو سمجھ سکتے تو ممکن ہے کہ جو کچھ انھوں نے یونیورسٹی میں پڑھا تھا بعد کا تجربہ اس کی عملی مثالیں پیش کرتا اور اس طرح وہ علوم ان کے دماغوں میں محفوظ رہتے ۔

یہاں تک میں نے ان ناگزیر قباحتوں کا ذکر کیا ہے جو جماعتی امتیاز سے پیدا ہوتی ہیں ، لیکن میں نے سب سے بڑی قباحت کی طرف جس کی حیثیت اخلاق ہے ، صرف اشارہ ہی کیا ہے ۔ جہاں کہیں غیر منصفانہ جماعتی امتیاز پایا جاتا ہے اس سے فائدہ اٹھانے والا شخص احساس جرم سے محفوظ رہنے کے لیے ایسے نظریوں کی طرف میلان رکھتا ہے جن کا منشا یہ ہو کہ وہ کسی نہ کسی لحاظ سے کم نصیب لوگوں کی نسبت بہتر ہے ۔ ان نظریوں کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ ہمدردیاں محدود ہو جائیں اور انصاف کی مخالفت اور حالت موجودہ کی حمایت کرنی پڑے ۔ اس طرح سے معاشرے

کے زیادہ خوش قسمت اراکین ترقی کے مخالف بن جاتے ہیں ، خطرات ان کے دل و دماغ پر چھائے رہتے ہیں اور وہ بزدلانہ طور پر ان تمام نظریوں سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں ، جن کا رحجان ان کے زاویۂ نگاہ سے تخریبی ہو اور جو اس لحاظ سے خود ان کے آرام و آسائش کے لیے خطرے کا باعث ہوں ۔ اس کے بر عکس قوم کے کم خوش قسمت افراد یا تو ذہنی تعطل کا اس طرح شکار ہو جاتے ہیں کہ انہیں اس بے انصافی کا احساس ہی نہیں رہتا جس کا وہ شکار ہو رہے ہیں، اور ان میں جذبۂ خود حرمتی کی اتنی کمی ہو جاتی ہے کہ وہ ان لوگوں کے سامنے جو ذاتی طور پر ان سے بہتر نہیں ہیں ، جھکنے پر رضامند ہو جاتے ہیں ، یا پھر وہ غصے اور حقارت سے بھر کر اس بے انصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں ۔ انہیں متواتر ستم رسیدگی کا احساس رہتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ دنیا کو اس شخص کی یرقانی آنکھوں سے دیکھنے لگتے ہیں جو اذیت رسانی کے جنون کا شکار ہو ۔ پس ان تمام بے انصافیوں کے جنہیں برداشت کر لیا جاتا ہے ، دو مضر پہلو ہوتے ہیں ؛ ایک خوش قسمت لوگوں کے متعلق اور دوسرا بد قسمت لوگوں کے بارے میں ۔ انصاف کے کسی لفظی حسن کی بنا پر نہیں بلکہ صرف بیان کردہ وجوہ کی بنا پر معاشرتی نظام برے خیال کیے جاتے ہیں ۔ ایک ایسے معاشرے میں جس کی اساس ہی بے انصافی پر ہو ، تعلیم کا اخلاقی پہلو کبھی وہ نہیں ہو سکتا جو ہونا چاہیے ۔ ممکن ہے غم و غصہ کے جذبات جو بہ ذات خود برے ہیں ، اس بے انصافی کو

مٹانے کے لیے جو جماعتوں ، قوموں اور مختلف صنفوں میں پائی جاتی ہے ، ایک ضروری قوت محرکہ کا درجہ رکھتے ہوں ، لیکن سیاسی ضرورت ان کی ذاتی غیر پسندیدگی کو ہرگز ختم نہیں کر سکتی اور ایک عمدہ معاشرے کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ اس میں مفید جذبات وہ سمجھے جائیں جو مشفقانہ ، دوستانہ اور تعمیری ہوں ، نہ کہ وہ جن میں غصہ اور تخریب پائی جائے ۔ اگر اس خیال کی پیروی کی جائے تو یہ دور تک ہماری رہنمائی کر سکتا ہے ، لیکن چونکہ ہمارا موضوع گفتگو تعلیم ہے اس لیے میں اس دلیل کو انتہا تک پہنچانے کا کام قارئین پر چھوڑتا ہوں ۔

باب دوازدهم

تعلیم میں مسابقت

انیسویں صدی کے غالب نظریات میں سے کچھ ہمارے زمانے تک باقی چلے آتے ہیں اور کچھ نہیں ۔ جو باقی رہ بھی گئے ہیں ان کا عمل دخل ہمارے زمانے میں آج سے سو سال پیشتر کے مقابلے میں بہت محدود ہو گیا ہے ۔ ان میں سے مسابقت کا نصب‌العین ایک عمدہ مثال ہے ۔ میرے خیال میں مسابقت کو ڈارون کے فلسفے کا نتیجہ قرار دینا غلطی ہے ، حقیقۃً معاملہ اس کے برعکس ہے ۔ ڈارون کا فلسفہ ، مسابقت پر اعتقاد رکھنے کا نتیجہ تھا ۔ زمانۂ جدید کا ماہر حیاتیات اگرچہ ابھی تک نظریۂ ارتقا کا قائل ہے ، لیکن وہ مسابقت کی قوت محرکہ پر ڈارون کی نسبت بہت کم یقین رکھتا ہے اور یہ تغیر ہی اس تبدیلی کا آئینہ دار ہے جو معاشرے کے اقتصادی ڈھانچے میں واقع ہوئی ہے ۔ جدید صنعت کا آغاز بہت چھوٹے چھوٹے کارخانوں سے ہوا جو ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے تھے اور جنہیں اول اول حکومت کی طرف سے جو ابھی تک زراعتی یا اشرافی حیثیت رکھتی تھی ، بہت کم امداد ملتی تھی ؛ اسی لیے ابتدائی دور کے صنعت‌کار خودکوشی ، مکمل آزادی اور مقابلے کے قائل تھے ۔ مقابلے کا خیال صنعت سے دوسری فضاؤں

میں پھیل گیا ۔ ڈارون نے لوگوں کو یہ تسلیم کرنے پر آمادہ کیا کہ مسابقت کا جذبہ ھی زندگی کی مختلف صورتوں میں ارتقائی ترقی کا سبب ہے ۔ ماھرین تعلیم بھی اس خیال کی طرف مائل ھو گئے کہ طلبہ میں محنت کی خواھش پیدا کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جماعت کے کمرے میں مسابقت کا جذبہ پیدا کیا جائے ۔ کارخانہداروں نے آزاد مقابلے کے عقیدے کو ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں کے خلاف بطور دلیل استعمال کیا اور امریکہ کے بعض پس ماندہ علاقوں میں اب بھی اسے یوں ھی استعمال کیا جا رھا ہے ، لیکن سرمایہداروں میں مقابلہ تدریجاً کم ھوتا گیا ۔ عام رجحان یہ رھا ہے کہ ایک پوری صنعت قومی طور پر متحد ھو جائے ۔ پس مقابلہ زیادہ تر قوموں میں ھونے لگا ہے اور ایک ھی قوم کے مختلف کارخانوں میں پہلے کی نسبت مقابلے کا میلان بہت کم ھو گیا ہے ۔ اگرچہ اس اثنا میں سرمایہدار خود متحد ھوتے گئے ، لیکن پھر قدرتی طور پر ان کی یہ کوشش رھی کہ جہاں تک ھو سکے مزدور متحد نہ ھونے پائیں ۔ ان کا نصب العین یہ رھا ہے کہ ”ھم متحد ھو کر کامیاب ھوں گے اور نااتفاق سے ناکام“ اسی لیے آزاد مقابلے کو سر برآوردہ کارخانوں کی سرگرمیوں کو چھوڑ کر انسانی زندگی کے تمام باقی شعبوں میں ایک عظیم الشان نصب العین کی حیثیت سے محفوظ رکھا گیا ۔ جہاں تک سر برآوردہ کارخانہداروں کا تعلق ہے ، مسابقت قومی ہے اور اسی لیے قومیت کی حوصلہ افزائی کا روپ اختیار کیے ھوئے ہے ۔

تعلیم میں مسابقت کے نصب العین سے دو خرابیاں پیدا

ہوئیں ۔ ایک طرف تو اس نے بالخصوص بین الاقوامی معاملات میں تعاون کی بجائے مقابلے کو پسندیدہ سمجھنے کی تعلیم دی اور دوسری طرف طلبہ کی جماعت میں تعلیمی وظائف کے حصول اور بعد میں نوکری کی تلاش کے لیے مسابقت کا ایک بڑا سلسلہ قائم کر دیا ۔ جہاں تک مزدوروں کا تعلق ہے ، مزدوروں کی انجمنوں کی وجہ سے اس آخری درجے میں کسی قدر نرمی پیدا ہو گئی ہے ، لیکن پیشہ ور لوگوں میں اس کی شدت بدستور موجود ہے ۔

تعلیمی فضا میں مقابلے کی سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے بالخصوص اچھے لڑکوں کو بہت کچھ ضرورت سے زیادہ تعلیم ملنے لگی ۔ زمانۂ حال میں مغربی یورپ کے تمام ممالک میں (گو شمالی اور جنوبی امریکہ میں نہیں) یہ خطرناک رجحان پایا جاتا ہے کہ ننھے بچوں پر تعلیم اس قدر ٹھونسی جائے کہ نہ صرف ان کی قوت متخیلہ اور ذہانت بلکہ جسمانی صحت کو بھی نقصان پہنچے ۔ بدقسمتی سے ہوشیار ترین بچے ہی اس رجحان سے زیادہ نقصان اٹھا رہے ہیں ۔ ہر نسل میں مسابقت کے جلیل القدر دیوتا کی قربان گاہ پر بہترین دماغوں اور بہترین قوت ہائے متخیلہ کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے ۔ ایسے شخص کے لیے جسے میری طرح یونیورسٹی میں قوم کے بہترین دماغوں کو دیکھنے کا تجربہ ہوا ہو ، بچوں پر حد سے زیادہ دباؤ ڈالنے کا نقصان جگر گداز ہے ۔ مغربی یورپ کے مقابلے میں امریکہ کی تعلیمی مشینری کئی لحاظ سے کمتر درجے کی ہے لیکن اس لحاظ سے وہ ان سے بہتر ہے ۔ امریکہ کے

قابل اور نوجوان اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے میں ثقافت اور
مض علم کی وہ وسعت بہت کم پائی جاتی ہے جو یورپ
کے اس طبقے میں موجود ہے، لیکن ان میں شوق علم،
جوش تحقیق اور ذہنی اختراع کی وہ تازگی پائی جاتی ہے
جن کی جگہ یورپ میں وبال جان اور افسردہ کن "درستی"
نے لے رکھی ہے۔ علم کی محبت کم ہوئے بغیر علم سیکھنا
مشکل ہے اور یہی وہ گتھی ہے جس کا حل ابھی یورپ کے
معلمین معلوم نہیں کر سکے۔

نوجوانوں کا وہ پہلا وصف جسے اوسط درجے کا معلم
تباہ کرنا شروع کرتا ہے، ان کی قوتِ متخیلہ ہے۔ یہ
قوت سرکش، غیر منضبط، منفرد اور "نہ درست اور نہ
غلط" ہوا کرتی ہے، لیکن ان پہلوؤں سے یہ خوبی استاد
کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے، بالخصوص جب مسابقت کے لیے
طالب علموں کی قابلیت کی کڑی درجہ بندی ضروری ہو۔
بچوں کی قوتِ متخیلہ سے صحیح برتاؤ کرنے کا مسئلہ اس
لحاظ سے اور مشکل ہو جاتا ہے کہ بہت سے بچوں کی
قوتِ متخیلہ حقیقی دنیا سے دل چسپی بڑھنے کے ساتھ ہی
آناً فاناً مرجھانے لگتی ہے۔ جن بالغوں کی قوتِ متخیلہ
مضبوط رہتی ہے وہی ہوتے ہیں جو بچپن سے اسے واقفیت
کے قید و بند سے آزاد رکھتے ہیں لیکن اگر ایک بالغ کی
قوتِ متخیلہ کو کارآمد ثابت ہونا ہے تو واقفیت سے اس
کی آزادی ناواقفیت پر نہیں بلکہ ایک خاص قسم کی غلامانہ
ذہنیت کے فقدان پر مبنی ہونی چاہیے۔ فرینِاتا دیگلی اوبرٹی
(Farinata degli Uberti) کو دوزخ سے سخت نفرت

تھی ، گو اسے ابد تک وہیں رہنا تھا ۔ واقعیت کے متعلق یہی نقطۂ نظر زیادہ‌تر ایک بالغ میں بار آور قوتِ فکر کو ترقی دیتا ہے ۔

زیادہ ٹھوس حقائق تک جانے کے لیے بچوں کی ڈرائنگ اور منظر کشی ہی کو لیجیے ؛ پانچ سے آٹھ سال کی عمر کے بہت سے بچے کافی حد تک تصویری تخیل کا ثبوت دیتے ہیں بشرطیکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور ویسے انہیں بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے ۔ کچھ طلبہ ، گو ان کی تعداد کم ہے ، منظر کشی کی اس خواہش کو جذبۂ خود تنقیدی کے پیدا ہونے کے بعد بھی قائم رکھ سکتے ہیں لیکن اگر انہیں احتیاط سے نقل کرنا اور نہایت درستی سے چربہ اتارنا سکھایا گیا ہے تو وہ آرٹسٹ ہونے کے بجائے بہت زیادہ سائنسی بن جائیں گے اور ان کی منظر کشی میں تخیل کا خاتمہ ہو جائے گا ۔ اگر اس چیز سے بچنا منظور ہو تو انہیں درست منظر کشی بالکل نہ سکھائی جائے جب تک وہ خود رہنمائی کی استدعا نہ کریں اور ان کے ذہن میں یہ خیال بالکل پیدا نہ ہو کہ درست منظر کشی بھی کوئی خوبی ہے ۔ ایسا کرنا استاد کے لیے مشکل ہے کیوں کہ فنی کمال ، انفرادی رائے اور ذوق کا معاملہ ہے اور درستی کی خارجی جانچ پڑتال کی جا سکتی ہے ۔ مدرسے کی تعلیم کا سماجی عنصر یعنی جماعت کا ایک فرد ہونا (سوائے اس حالت کے کہ استاد نہایت غیر معمولی شخص ہو) ، ایسی خوبی پیدا کرنے کا میلان رکھتا ہے جو سماجی طور پر جانچی جا سکے ، بجائے ایسی خوبی کے جس کا انحصار ذاتی اوصاف پر ہو ، اگر

ذاتی وصف کی حفاظت منظور ہے تو معین تعلیم کو گھٹا کر کم از کم کر دینا چاہیے اور تنقید کو اس حد تک نہ بڑھا دینا چاہیے کہ خود اظہاری میں بزدلی پیدا ہونے لگے، لیکن حکمت کے ان نکات کے ماتحت کوئی ایسا کام نہیں ہو سکے گا جو انسپکٹر کو پسند آ سکے۔

ذرا آگے بڑھ کر اسی چیز کا اطلاق ادب کی تعلیم پر بھی ہو سکتا ہے۔ اساتذہ میں بہت زیادہ پڑھانے کا رجحان ہوتا ہے اور تحریر کے متعلق احمقانہ قاعدے بنائے جاتے ہیں، مثلاً یہ کہ کوئی فقرہ 'اور' اور 'لیکن' سے شروع نہ ہو۔ صرف و نحو کے بعض ضروری قواعد کا بلاشبہ ضرور خیال رکھنا چاہیے لیکن اس میں بھی اکثر اساتذہ کے خیال سے کہیں زیادہ لچک پائی جاتی ہے، مثلاً جس بچے نے یہ لکھ دیا:

"ملعون ہے وہ شخص جو پہلے چیخ اٹھتا ہے، ٹھہرو، بس۔"

ایسے فقرے کی لغویت ہی کی بنا پر نہیں بلکہ غلط گرامر کی وجہ سے بھی برا بھلا کہا جائے گا۔ منظر کشی کی طرح علم ادب میں بھی یہی خطرہ ہے کہ مبادا فنی کمال کا مقام درست نویسی کو مل جائے۔ علم ادب کی تدریس صرف مطالعے تک ہی محدود رکھی جانی چاہیے، جو وسیع ہونے کے بجائے عمیق ہو۔ ایسی چیزوں کو از بر کر لینا اچھا ہے جن سے بلا ارادہ مسرت حاصل ہو لیکن کسی ایسی چیز کا پڑھنا خواہ وہ لاکھ کلاسیکی ہو، جس سے پڑھنے والے کو لطف محسوس نہ ہو، تعلیم ادب کے نقطۂ نگاہ سے

بیکار ہے ، جو ادب شوق سے پڑھا جائے اور کماحقہ سمجھا جائے وہ انتخاب الفاظ اور طرز تحریر پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ لیکن اس کے مقابلے میں جس ادب کو انسان ایک آدھ دفعہ بے دلی سے پڑھے ، اس سے صرف ایک قسم کی مصنوعی دانشمندانہ گفتگو کرنے کی صلاحیت میں تو ترقی ہوتی ہے اور بس ۔ بے شک لڑکوں کو لکھنا بھی چاھیے اور پڑھنا بھی ، لیکن وہ جو کچھ لکھیں نہ تو اس پر تنقید کی جائے اور نہ ھی انھیں یہ بتایا جائے کہ استاد کی رائے میں بہتر لکھنے کی کیا صورت ہو سکتی تھی ۔ جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے ، انھیں کچھ سکھانا نہ چاھیے ۔

جب ہم تخیل سے ذھانت کی طرف آتے ھیں تو چند خاص امور کے ساتھ جو تھکن سے متعلق ھیں ، کچھ ایسے ھی اور خیالات کو بر محل پاتے ھیں ۔ تھکن عام ہو سکتی ہے اور خاص بھی ۔ اول الذکر پر جسمانی صحت کے اعتبار سے غذر ہونا چاھیے لیکن آخرالذکر تمام ان لوگوں کے پیش نظر رھنی چاھیے جو ذھنی تربیت میں مصروف ہوں ۔ قارئین کو پولوف کے کتے کا واقعہ یاد ہوگا جس نے بیضوی اشکال اور دائرے میں فرق کرنا سیکھ لیا تھا لیکن جس طرح آھستہ آھستہ پولوف بیضوی شکلوں کو دائرے کے قریب لاتا گیا اور آخرکار ایسے مقام پر پہنچ گیا کہ چھوٹے اور بڑے محور میں آٹھ نو کی نسبت رہ گئی تو یہاں کتے کی قوت تمیزہ ھار گئی اور اس کے بعد اس نے بیضوی اشکال اور دائرے کے متعلق جو کچھ سیکھ رکھا تھا ، سب کچھ بھلا دیا ۔ اکثر لڑکے اور لڑکیوں کو مدرسے میں بھی

حالت پیش آتی ہے ۔ اگر انھیں ایسے مسائل حل کرنے پر مجبور کیا جائے جو یقینی طور پر ان کی سمجھ سے بالاتر ہوں تو ان پر ہر ایک قسم کی حیران کن گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے اور یہ کیفیت صرف مذکورہ بالا مسائل کے متعلق ہی نہیں بلکہ ان تمام مسائل میں بھی واقع ہوتی ہے جو عملی طور پر اس کے قریب قریب ہوتے ہیں ۔ بہت سے لوگ مضامین ریاضی میں زندگی بھر پھسڈی رہتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انھوں نے بہت چھوٹی عمر میں ان کا مطالعہ شروع کر دیا تھا ۔ مدرسوں میں جن اوصاف کو آزمایا جاتا ہے ان میں خالص غور و فکر کی قوت وہ وصف ہے جو سب سے آخر میں نشو و نما پاتا ہے جیسا کہ اس مواد سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو پیاگے (Piaget) نے اپنی بیش قیمت کتاب ''بچے کا استدلال اور فیصلہ'' (Judgement and Reasoning of the Child) میں جمع کیا ہے ۔ ایک ملاّمنش انسان جب تک وہ کامل ماہر نفسیات اور بہت ہی تجربہ کار نہ ہو، کبھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ بچے اتنے ہی کوڑ مغز ہوتے ہیں جتنے کہ وہ حقیقتاً ہوتے ہیں ۔ جب تک وہ سوالات کے درست زبانی جواب دیتے رہتے ہیں، یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ مضمون کو سمجھے ہوئے ہیں ۔ ریاضی اور حساب عموماً بہت ہی ابتدائی عمر میں پڑھے جاتے ہیں ۔ نتیجۃً بہت سے طلبہ میں پولوف کے کتے کی طرح ان علوم کے متعلق ایسی ہی مصنوعی کند ذہنی پیدا ہو جاتی ہے جیسے اس کتے میں علم ہندسہ کے متعلق پیدا ہو گئی تھی ۔ اس سوء اتفاق سے بچنے کے لیے

ضروری ہے کہ استاد علم نفسیات سے کسی قدر واقف ہونے کے علاوہ پڑھانے کے فن میں بھی ماہر ہو اور بوقت ضرورت اسے نصاب تعلیم میں تبدیلی کی اجازت ہو ۔ اس وقت پڑھانے کے فن میں مہارت صرف انھی اساتذہ کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے جو غریبوں کو پڑھاتے ہیں لیکن شرفا کے بچوں کو تا حال غیر تربیت یافتہ استاد ہی پڑھا رہے ہیں ۔ اظہارِ امارت کا یہ ایسا نتیجہ ہے جس کے بارے میں پیش گوئی کرنا ممکن نہیں ۔

تھکن سے ذہانت کی حقیقی استعداد کو نقصان پہنچتا ہے اور اسی لیے یہ بڑی خطرناک چیز ہے لیکن علمی مباحث میں طالب علم کی ہمت شکنی (جس کی وجہ زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ بالکل بے سود ہوتا ہے) اگرچہ بہت آفت انگیز نہیں لیکن پھر بھی نہایت ضرر رساں ہے ۔ سو طلبہ کی ایک اوسط درجے کی جماعت کو لیجیے، میرا اندازہ ہے کہ نوے فی صدی صرف سزا کے ڈر سے پڑھتے ہیں اور نو فی صدی مقابلے میں کامیابی کے لیے اور صرف ایک فی صدی علمی شوق سے ۔ یہ افسوسناک صورت ناگزیر نہیں اگر اوقات تعلیم کم کر دیے جائیں ، اسباق میں حاضری اختیاری کر دی جائے اور اچھے طریق سے پڑھایا جائے تو ستر فی صدی طلبہ میں علم کا شوق پیدا کیا جا سکتا ہے ۔ جب اس محرک کو اکسایا جائے تو توجہ رضامندانہ ہو جاتی ہے ، اس میں جبر کا عنصر نہیں رہتا؛ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تھکن بہت کم ہو جاتی ہے اور قوت حافظہ بہت زیادہ بہتر ہو جاتی ہے ۔ علاوہ بریں تحصیلِ علم میں

لذت محسوس ہونے لگتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رسمی تعلیم کے زمانے کے بعد بھی اس کا جاری رہنا اغلب ہو جاتا ہے - تجربے سے معلوم ہو جائے گا کہ رضاکارانہ اسباق کے مختصر اوقات میں جتنا کچھ سیکھا جاتا ہے اس کے مقابلے میں جبری اوقات کی بیزاری میں بہت کم حاصل ہو سکتا ہے ، لیکن استاد کو چاہیے کہ وہ تعلیم کو طالب علم کے احساس افادیت کے مطابق ڈھالے اور اسے خوف زدہ کر کے خواہ مخواہ یہ ماننے پر مجبور نہ کرے کہ قدیم خرافات کو کوئی پر اسرار اہمیت حاصل ہے ۔

جامعی تعلیم کے اعلیٰ ترین مدارج کو چھوڑ کر باقی ہر قسم کی تعلیم میں ایک عقلی قباحت بھی ہے ، یعنی وہ جذبۂ فرمان برداری کے ساتھ ساتھ اس یقین کی بھی ہمت افزائی کرتی ہے کہ ان تمام مسائل کے جو جائز طور پر بحث طلب ہیں ، یقینی جواب موجود ہیں ۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے جب ہم چند آدمی بحث کر رہے تھے کہ شکسپیئر کے ڈراموں میں کون سا سب سے بہتر ہے ، ہم میں سے اکثر غیر رسمی آرا کے حق میں دلائل پیش کر رہے تھے لیکن ایک ہوشیار نوجوان نے جو ابتدائی مدرسے سے ترقی پا کر ابھی ابھی یونیورسٹی میں آیا تھا ، ہمیں بتایا اور نہ معلوم ہم کیوں اس حقیقت سے ناآشنا تھے کہ ہیملٹ اس کا بہترین ڈراما ہے ، اس کے بعد بحث ختم ہو گئی ۔ امریکہ کا ہر پادری جانتا ہے کہ روم کیوں فتح ہوا ۔ اس کی وجہ جوونیل (Juvenal) اور پیٹرونیس (Petronius) کے بیان کے مطابق اہل روم

کی بد اخلاق تھی ، لیکن یہ حقیقت کسی کو معلوم نہیں یا اس سے چشم پوشی کی جاتی ہے کہ مغربی سلطنت کے خاتمے سے دو صدی پیشتر اخلاق قابل تقلید حد تک بلند تھے ۔ انگریز بچوں کو انقلاب فرانس کا ایک رخ بتایا جاتا ہے اور فرانسیسی بچوں کو دوسرا ، دونوں میں سے کوئی بھی درست نہیں ، لیکن دونوں صورتوں میں استاد سے اختلاف رکھنا حد درجے کی نا عاقبت اندیشی ہوگی اور بہت کم لوگوں میں ایسا میلان پیدا ہوگا ۔ اساتذہ کو شاگردوں کے معقول اختلاف کی ہمت افزائی کرنی چاہیے بلکہ انہیں ایسی کتابیں پڑھنے پر اکسانا چاہیے جن میں استاد کے بیان کردہ خیال کے خلاف اظہار رائے کیا گیا ہو ، لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم کا بیشتر حصہ اسی چیز پر مشتمل ہو کر رہ جاتا ہے کہ طالب علم میں ذوق جستجو کے بجائے بے بنیاد عقائد ذہن نشین کیے جائیں ۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کی ذمہ داری استاد کی کوتاہی پر ہو ، بلکہ وہ نصاب تعلیم بھی اس کا ذمہ دار ہے جو طالب علم سے بہت سے ظاہری علم کی توقع رکھتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پڑھانے میں عجلت اور غیر مناسب قطعیت کی ضرورت داعی ہو جاتی ہے ۔

حد سے زیادہ تعلیم کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس سے طالب علم کی صحت بالخصوص دماغی صحت پر برا اثر پڑتا ہے ۔ یہ خرابی جس صورت میں انگلستان میں پائی جاتی ہے اس کی وجہ لبرلوں کے اس

مقولے کا اطلاق ہے کہ ''مواقع یکساں ہونے چاہییں''۔ ابھی زمانۂ حال تک تعلیم آسودہ حال لوگوں کے بچوں کا امتیازی حق تھا لیکن جمہوریت کے زیر اثر بالکل صحیح طور پر یہ محسوس کیا گیا کہ اعلیٰ تعلیم کے دروازے ان تمام لوگوں کے لیے کھلے ہونے چاہییں جو اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور استفادے کی اہلیت کا مدار زیادہ تر ذہانت پر ہے۔ اس کا حل یہ معلوم ہوا کہ تعلیمی وظائف وسیع پیمانے پر دیے جائیں؛ چنانچہ وہ بچپن ہی میں تعلیمی استعداد اور زیادہ تر امتحانات مقابلہ کی بنا پر دیے جانے لگے۔ مسابقت کے اعلیٰ محاسن پر لوگوں کو جو اعتقاد تھا اس نے انھیں اس بات پر غور کرنے سے روکے رکھا کہ لڑکے لڑکیوں اور نوخیز بالغوں پر وہ بوجھ نہ ڈالنا چاہیے جو اس طرح ان پر ڈالا جا رہا ہے، اگر یہ بوجھ صرف عقلی ہوتا جب بھی برا تھا لیکن یہ جذباتی بھی ہے۔ کسی لڑکے اور لڑکی کے تمام مستقبل کا انحصار نہ صرف اقتصادی اعتبار سے بلکہ سماجی طور پر بھی اس مختصر سے امتحان میں کامیابی پر ہے جو لمبی چوڑی تیاری کے بعد لیا جاتا ہے۔ اس غریب گھرانے کے ہوشیار لڑکے کی حالت پر غور کیجیے جس کی تمام دل چسپیاں تقریباً عقلی ہیں لیکن جس کے ساتھی کتابوں کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ اگر وہ یونیورسٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو خوش گوار احباب کے ساتھ اور خوش گوار کام میں زندگی بسر کرنے کی توقع رکھ سکتا ہے، ورنہ نہ صرف افلاس بلکہ

ذہنی تنہائی بھی اس کا ستیاناس کر کے رکھ دے گی۔ اس متبادل صورت کے پیش نظر یقیناً وہ پورے اضطراب سے لیکن غیر دانش مندانہ طور پر محنت کرے گا اور تعلیم سے فراغت پانے سے پہلے ہی اپنی دماغی لچک کو تباہ کر لے گا۔

اگرچہ یہ قباحت ان تمام اساتذہ پر واضح ہے جنھیں یونیورسٹی میں پڑھانے کا تجربہ ہے لیکن اس کا ازالہ چنداں آسان نہیں۔ غالباً یہ غیر مناسب اور مالی لحاظ سے یقیناً ناممکن ہے کہ ہر شخص کو یونیورسٹی میں تعلیم دی جائے، اس لیے انتخاب کا کوئی طریقہ استعمال کرنا پڑے گا اور لازماً اس کا انحصار زیادہ تر ذہنی قابلیت پر ہوگا۔ اگر ذہن پر اتنا بار نہ پڑتا جتنا امتحانات مقابلہ میں پڑ جاتا ہے اور اگر اساتذہ شاگردوں کی ایک خاص تعداد کا انتخاب عام تاثرات کی بنا پر کر لیا کرتے تو بہت اچھا ہوتا۔ بلا شبہ اس طریقے میں کاسہ لیسی اور رو رعایت کا کچھ خطرہ ہے لیکن غالباً یہ قباحتیں موجودہ نظام کی قباحتوں سے زیادہ خطرناک نہیں ہوں گی۔ یہ بہتر ہوگا کہ جن لڑکوں کو یونیورسٹی میں تعلیم دینا ہے ان کا انتخاب بارہ سال کی عمر ہی میں کر لیا جائے جس کے بعد انھیں کسی امتحانی مقابلے کی تکلیف نہ دی جائے۔ البتہ ان سے مناسب محنت کرائی جائے اور بارہ برس کی عمر میں بھی ان کا انتخاب ان کی عملی استعداد کی بنا پر نہیں بلکہ ذاتی ذہانت کی بنا پر کیا جائے۔

ذھنی امتحانات کی یہی ایک خوبی ہے ، انگلستان میں ان کا استعمال بہت کم ہے لیکن امریکہ میں جس حد تک ان امتحانات پر تکیہ کیا جا رہا ہے ، میرے خیال میں اس کا بھی کوئی سائنسی جواز نہیں ، ان کی خوبی یہ نہیں کہ وہ بے عیب ہیں - کوئی امتحان بھی ایسا نہیں ہو سکتا ، بلکہ کم و بیش ان کے یہ نتائج مجموعی طور پر درست ہوتے ہیں اور ان میں اس تھکا دینے والی اور اعصاب فرسا تیاری کی ضرورت نہیں پڑتی جو عام طرز کے امتحانات کے لیے درکار ہوتی ہے -

شہری علاقوں میں جہاں کہیں آبادی کافی گھنی ہو ، زیادہ ہوشیار لڑکے لڑکیوں کے لیے خاص مدرسے ہونے چاہیں ، جیسے اس وقت بھی دماغی لحاظ سے معذور بچوں کے لیے ہیں - امریکہ میں اس سلسلے کی ابتدا ہو چکی ہے لیکن ابھی چھوٹے پیمانے پر ہے -

بعض نتائج دل چسپ ہیں ؛ مثلاً ایک لڑکا جس کی ذہانت کا حاصل قسمت ایک سو نوے تھا (عام معیار سو رکھا گیا تھا) ایک معمولی مدرسے میں پایا گیا جہاں اس کا کوئی دوست نہ تھا اور اسے احمق سمجھا جاتا تھا - ایسے لڑکوں کی ایک خاص جماعت میں جن کی ذہانت کا اوسط حاصل قسمت ایک سو چونسٹھ تھا منتقل کر دیا گیا ، جہاں اسے فوراً رہنما چن لیا گیا اور وہ اعتماد و احترام کے کئی مناصب پر فائز ہو گیا - اگر ہوشیار لڑکوں کو کند ذہن ساتھیوں سے بے تکلف اور میل ملاپ رکھنے پر مجبور نہ کیا جائے تو وہ بہت سی

تکالیف اور مصائب سے بچ سکتے ھیں۔ بعض لوگوں کا خیال ھے کہ جوانی میں ھر قسم کے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ آئندہ زندگی کے لیے اچھی تیاری کا باعث ھوتا ھے لیکن میرے خیال میں یہ بالکل لغو ھے۔ کوئی شخص بھی بعد کی زندگی میں ھر طرح کے لوگوں سے میل جول نہیں رکھتا۔ بک میکر پادریوں میں رھنے پر مجبور نہیں ھیں، نہ پادری بک میکروں میں۔ بعض کی زندگی میں ایک انسان کا پیشہ اور حیثیت اس کی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کا پتا دیتے ھیں۔ میں اپنے زمانے میں معاشرے کے مختلف سماجی طبقوں میں رھا ھوں، مثلاً سفیروں، یونیورسٹی کے ماھرین تعلیم، امن پسندوں، قیدیوں اور سیاست دانوں کے درمیان، لیکن کہیں بھی میں نے لڑکوں کے گروہ کی سی گڈمڈ اور بے رحمی نہیں دیکھی۔ اکثر ذھین لڑکوں کو ابھی تک اپنی ذھانت کو چھپانے کا ڈھب نہیں آیا اور اسی لیے انھیں اپنے انوکھے پن کی وجہ سے ھمیشہ تکلیفوں کا تختۂ مشق بننا پڑتا ھے، ان میں سے جو اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال سکتے ھیں، انھیں بہت جلد عام لڑکوں کا سا بننے اور اپنے ظاھر کو پرسکون اور کھوکھلا دکھانے کا ڈھنگ آ جاتا ھے، مگر میرے خیال میں یہ سبق سیکھنے کے قابل نہیں۔ اگر تم کسی فارم کے احاطے میں سے گزرو تو تمھیں گائیں، بھیڑیں، سؤر، بکریاں، ھنس، بطخیں، مرغیاں اور کبوتر اپنے مخصوص انداز میں چلتے پھرتے دکھائی دیں گے۔ کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ

سماجی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے بطخ کو سؤر کے طور طریقے سیکھ لینا چاہئیں ، تاہم بالکل یہی چیز ہے جو مدرسے کے لڑکوں کے لیے اتنی قیمتی خیال کی جاتی ہے، حالانکہ وہاں سؤر قسم کے لوگوں کو اشراف کا مقام حاصل ہوتا ہے ۔

ہوشیار لڑکوں کو خاص مدرسوں سے بہت بڑے فائدے پہنچنے کی توقع ہے ؛ وہ نہ صرف سماجی تکالیف سے بچ جائیں گے بلکہ بہت سی ایسی مصیبتوں ، جذباتی تکانوں اور بزدلی کے اسباق سے بھی محفوظ رہیں گے جو ہوشیار بالغوں کو اکثر طاقت ور احمقوں کی خاطر اپنی قابلیت کو ذلیل کاموں میں لگانے پر مجبور کر دیا کرتے ہیں ۔ خالص عقلی زاویۂ نگاہ سے انھیں بہت جلد بڑھایا جا سکتا ہے ، نیز انھیں وہ بیزاری بھی برداشت نہیں کرنا پڑے گی جو ان جانی بوجھی چیزوں کے سننے سے پیدا ہوگی جو ان کے ہم جماعتوں کو سمجھائی جاتی ہیں ؛ نیز اغلب یہ ہے کہ ان کی باہمی گفتگو ایسی ہو جو علم کو ان کے حافظے میں محفوظ کر دے ، اور ان کے اوقات فرصت کے مشاغل ذہنی ہو سکتے ہیں اور انھیں تضحیک کا خوف بھی نہ ہوگا ۔ انتظامی دقتوں اور اس جمہوری جذبے کے سوا جس کی اساس جذبۂ رقابت ہے ، ایسے مدرسوں کے خلاف اور کوئی دلیل نہیں دی جا سکتی ۔ موجودہ حالات میں ہر ہوشیار لڑکے اور لڑکی کو اپنے نرالے پن کا احساس ہونے لگتا ہے ، ایسی فضا میں یہ احساس کافور ہو جائے گا ۔

ہر وسیع تعلیمی مشینری میں ایک دقت یہ ہوتی ہے کہ عموماً انتظام کرنے والے لوگ مدرس نہیں ہوتے اور اسی لیے انھیں تجربہ نہیں ہوتا کہ کون سی چیز ممکن ہے اور کون سی غیر ممکن۔ جب ایک آدمی پڑھانے لگتا ہے تو سوائے اس صورت کے کہ جب اسے مخصوص ذہین لڑکوں کی منتخب جماعت کو پڑھانے کا موقع ملے، اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ چھوٹے بچے خلاف توقع بہت کم اور بہت ہی آہستہ سیکھتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی مضمون پڑھنے کے قابل ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ پڑھانے کے قابل بھی ہو کیونکہ اوقات سبق میں اکثر طلبہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں سیکھ سکیں گے۔ جن نصاب تیار کرنے والوں کو پڑھانے کا تجربہ نہیں ہوتا ان کا رجحان ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں ضرورت سے زیادہ چیزیں ٹھونس دیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز سے بھی مکمل واقفیت نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس احتمال یہ ہے کہ ایک تجربہ کار استاد کا میلان بخاطر اس سے مختلف اور وہ بھی اتنا ہی غیر پسندیدہ ہوگا۔ چونکہ اسے قابلیت وار طلبہ کی درجہ بندی کرنا ہوتی ہے اس لیے وہ زیادہ تر ایسے مضامین کو ترجیح دینے کی طرف مائل رہتا ہے جن میں اس شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو کہ آیا طالب علم کا جواب درست ہے یا نہیں۔ لاطینی گرامر کا دیر تک جو رواج رہا اس کی وجہ ایک حد تک یہی تھی؛ اسی بنا پر حساب کا رتبہ بھی حد سے بڑھایا گیا ہے۔ انگلستان کے

ابتدائی مدرسوں میں اس پر ضرورت سے زیادہ وقت صرف کیا جاتا ہے ، ایک اوسط درجے کے آدمی کے لیے معمولی حساب کتاب کا جاننا ضروری ہے لیکن آئندہ زندگی میں اسے دوسرے سوالوں سے شاذ ہی واسطہ پڑتا ہے۔ حساب کے پیچیدہ قواعد کے بارے میں اس نے جو کچھ سیکھا ہوگا وہ بعد کی زندگی میں عملی طور پر اس لاطینی سے زیادہ فائدہ نہیں دے گا جو وہ اتنے ہی وقت میں سیکھ لیتا ۔ اس کا فائدہ اس علم تشریح الابدان ، فزیالوجی اور ابتدائی علم الصحت سے یقیناً کم ہوگا جو اتنے ہی وقت میں سیکھے جا سکتے تھے ۔

ضرورت سے زیادہ تعلیم دینے کا سوال اہم ہونے کے علاوہ مشکل بھی ہے ۔ اہم اس لحاظ سے کہ جب کسی ہوشیار شخص کو ضرورت سے زیادہ تعلیم دی جائے تو وہ آمد ، خود اعتمادی اور صحت کو کھو بیٹھتا ہے اور معاشرے کا اس سے کہیں کمتر مفید فرد بنتا ہے جتنا اسے ہونا چاہیے تھا ۔ مشکل اس لیے کہ جتنا موجودہ علوم کا ذخیرہ بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی پیچیدہ عملی مسائل اور سائنسی انکشافات سے متعلق تمام مفید مطلب امور کا جاننا زیادہ تکلیف دہ ہوتا جاتا ہے ۔ پس ہم ضرورت سے زیادہ تعلیم کی قباحتوں سے یہ کہہ کر نہیں بچ سکتے "چلو لڑکے لڑکیوں کو وحشی بن جانے دو اور ضرورت سے زیادہ پڑھا کر انہیں پریشان نہ کرو ۔" ہمارے سماجی ڈھانچے کا روز افزوں انحصار تربیت یافتہ اور ذی علم ذہانت پر ہوتا جا رہا ہے ۔ موجودہ عالم گیر

کساد بازاری کی سب سے بڑی وجہ عملی لوگوں میں علمی کمی ہے ۔ اگر بنکار اور سیاست دان راغ الوقت سکے اور مالی ساکھ کی پیچیدگیوں سے آشنا ہوتے تو ہم سب بڑے سے لے کر چھوٹے تک موجودہ حالت کے مقابلے میں زیادہ دولت مند ہوتے ۔ ایک دوسری مثال لیجیے ؛ اگر لوگ پچیس سال کی عمر تک موجودہ علوم و فنون کی سرحد تک نہ پہنچ جایا کریں تو سائنسی علوم کی ترقی کی موجودہ رفتار کو قائم رکھنا ناممکن ہو جائے کیوں کہ تیس سال کی عمر کے بعد حقیقی جدت پسندی کی صلاحیت بہت کم لوگوں میں باقی رہ جاتی ہے اور ایک اوسط درجے کا شہری پیچیدہ دنیا میں اپنا کردار اس وقت تک ادا نہیں کر سکتا جب تک وہ عملی تنقیح طلب امور کو ایسے مسائل کی حیثیت سے دیکھنے کا بہتر عادی نہ ہو جائے جن کا تصفیہ جانب داری ، جذباتی اور محض لفاظی کے بجائے حقائق کے انبار کے متعلق تربیت یافتہ ذہانیت کے استعمال سے کیا جا سکے ۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر جدید سماجی نظام میں ذہنی تعلیم بہت بڑی اہم ضرورت ہے ۔

کافی تعلیم کا ہونا لازمی ہے لیکن اس میں زائد از ضرورت تعلیم کی قباحتیں بالکل نہیں ہونی چاہئیں ؛ اس کے لیے تین شرطیں ضروری ہیں : پہلی اور سب سے ضروری یہ ہے کہ تحصیل علم کے ضمن میں جذباتی بوجھ امکانی حد تک کم ہونا چاہیے ۔ اس کے لیے امتحانات اور وظائف کے نظام میں اہم تبدیلیاں کرنا پڑیں گی اور

جہاں تک ممکن ہو سکے زیادہ ہوشیار طلبہ کو علیحدہ کرنا پڑے گا۔ مضر تھکن کا سب سے بڑا سبب، جذباتی کوفت ہے، ہر رات نیند کے دوران میں جسمانی تھکن کی طرح خالص ذہنی تھکن کی بھی تلافی ہو جاتی ہے۔ جذباتی تھکن کی وجہ سے اول تو کافی نیند آتی ہی نہیں اور یا پریشان خوابوں کی وجہ سے غیر سکون بخش ہو جاتی ہے اس لیے تعلیم کے دوران میں جہاں تک ممکن ہو، نوجوانوں کی زندگی پریشانیوں سے پاک ہونی چاہیے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ تعلیم کے غیر مفید حصوں کو نہایت سختی سے نصاب تعلیم سے خارج کر دیا جائے۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ نوجوان لڑکے اور بچے صرف وہی کچھ سیکھیں جسے مفید علم کہتے ہیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ بعض چیزوں کو محض اس وجہ سے نہ سیکھیں کہ وہ ہمیشہ سکھائی جاتی رہی ہیں۔ میں نے اکثر ان لڑکوں سے جو ابھی ابھی مدرسے سے فارغ ہوئے تھے، سوال کیا کہ انہیں تاریخ کتنی پڑھائی گئی ہے؟ مجھے عموماً یہی معلوم ہوا کہ انہیں ہر نئی جماعت میں برطانوی تاریخ ہنگسٹ (Hengest) اور ہورسا (Horsa) سے لے کر نارمن فتوحات تک بار بار پڑھائی گئی اور اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں جانتے۔ ممکن ہے میں مستثنیات میں سے ہوں لیکن مجھ پر کبھی ایسی حالت وارد نہیں ہوئی کہ میرے لیے یہ جاننا مفید ہوتا کہ آٹھویں صدی میں مرشیا (Mersia) اور ویسکس (Wessex) کی حکومتوں کے تعلقات کیسے تھے۔

تاریخ میں بہت سا ایسا مواد ہے جس کا علم نہایت مفید ہے لیکن مدرسوں میں مشکل ہی سے یہ چیزیں کبھی پڑھائی جاتی ہیں ۔

تیسری شرط یہ ہے کہ ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم اس خیال سے دی جائے کہ طالب علم سوالات کا صحیح جواب دینے کے بجائے علمی تحقیق کی روح اور تکنیک کو سیکھ جائے ، اس کی ذمہ‌داری بھی امتحانات پر ہے ؛ جو نوجوان طالب علم انگریزی علم ادب کا ابتدائی امتحانات پاس کرنا چاہتا ہے ، غالباً اس کے لیے بہتر مشورہ یہی ہے کہ وہ بڑے بڑے مصنفین کا ایک لفظ بھی نہ پڑھے بلکہ ان بیاضوں کو یاد کرے جن میں باستثناً مفید چیزوں کے ، باقی تمام معلومات درج ہوں ۔ امتحان کی خاطر نوجوان کو سب کچھ مثلاً تاریخیں وغیرہ زبانی یاد کرنا پڑتی ہیں ، حالانکہ انھیں کتب حوالہ میں ڈھونڈھنا زیادہ قرین عقل ہے ۔ موزوں تدریس انسان کو کتابوں کا صحیح استعمال سکھاتی ہے ، نہ کہ قوت حافظہ کا ایسا مہمل کارنامہ جو کتابوں کو غیر ضروری بنا دے ۔ مابعد طیلسانی (Post-graduate) تعلیم میں اس چیز کا عملاً اعتراف کر لیا گیا ہے لیکن اس کا احساس تعلیم کے بہت ہی ابتدائی درجے پر ہونا چاہیے اور طالب علم کے ذوق جستجو کا اندازہ اس کے نتائج کی قدامت پسندی یا جدت پسندی سے نہیں بلکہ علم کی وسعت اور دلائل کی معقولیت سے لگانا چاہیے ۔ یہ طریقہ صرف صحیح نتائج اخذ کرنے کی قوت اور طالب علم کی ذہنی اپج کے زندہ

رہنے کے طریقے ہی نہیں سکھائے گا بلکہ حصول علم کو پرلطف بنا دے گا ۔ اس سے وہ ذہنی تھکن کافی حد تک کم ہو جائے گی جو اس طریق کار سے پیدا ہوتی ہے ۔ دماغی کاموں سے زیادہ تر تھکن اس وجہ سے ہوتی ہے کہ انسان کو بیزار کر دینے والی چیزوں کی طرف مجبوراً متوجہ ہونا پڑتا ہے ؛ اسی لیے جس طریقے سے بیزاری دور ہو سکے وہی طریقہ تھکن کو بھی بہت کچھ دور کر دے گا ۔

ان طریقوں سے صحت اور آمد کو خطرے میں ڈالے بغیر اعلیٰ تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے لیکن جب تک امتحانات اور مسابقت کے کابوس موجود ہیں اس وقت تک یہ ممکن نہیں ۔ مسابقت صرف تعلیمی حقیقت کے لحاظ ہی سے بری نہیں بلکہ اسے نوجوان کے سامنے بطور نصب‌العین کے پیش کرنا بھی برا ہے ۔ دنیا کو اس وقت مقابلے کی نہیں بلکہ تنظیم اور تعاون کی ضرورت ہے ، مسابقت کی آفادیت پر اعتقاد رکھنا اب ایک تاریخی سہو ہے ؛ گو مقابلہ مفید بھی ہو جب بھی یہ بہ ذات خود قابل تعریف نہیں کیوں کہ جن جذبات سے اس کا تعلق ہے وہ دشمنی اور بیدردی کے جذبات ہیں ۔ جن لوگوں کے دل و دماغ میں مقابلہ رچ چکا ہے ان کے لیے معاشرے کو ”عضویاتی کل“ تصور کرنا بہت مشکل ہے ، اس لیے بچوں کو مسابقت کا سبق دینا اخلاق اور اقتصادی ہر دو لحاظ سے غیر موزوں ہے ۔

باب سیزدھم

اشتمالی نظام میں تعلیم

ہم سابقہ ابواب میں ان نقائص پر بحث کر چکے ھیں جو تعلیم میں ذاتی املاک کے رواج اور سرقبیلی خاندان کے ساتھ اس کے تعلق کی وجہ سے پیدا ھوئے ھیں ۔ اب ھم دیکھنا چاھتے ھیں کہ آیا اشتمالیت کے زیر اثر بھی ایسی ھی خطرناک قباحتوں کے پیدا ھونے کا احتمال ھے ، یا آیا اس کے بر عکس اشتمالیت کے ماتحت عوامی تعلیم ایسی اچھی ھو سکتی ھے جیسی سرمایہ دارانہ نظام کے ماتحت کبھی نہیں ھو سکتی ۔

اگرچہ اس سلسلے میں روس میں تعلیم کی موجودہ حالت پر غور ھونا چاھیے لیکن پھر بھی بلا شبہ یہ فیصلہ کن شے نہیں ، کیونکہ روس ابھی تک تعمیر میں مصروف ھے اور منتہائے مقصود سے بہت دور ھے ، لہذا ھمارے مقصد کے لیے اس چیز پر غور کرنا کہ حکومت روس کی توقعات اور ارادے کیا ھیں ، ھر چیز سے کہیں مفید تر ھے کہ اس نے تا حال کیا کچھ کیا ھے ۔ جو کچھ اس وقت تک ھوا ھے اس کی حیثیت لازمی طور پر مصالحانہ ھے ۔ آغاز انقلاب میں روسیوں کی اکثریت ناخواندہ تھی اور کسانوں کی ذھنیت جو آبادی کا اسی فی صدی تھے ،

حد درجہ قدامت پرستانہ تھی ۔ سرمایہ ، مدارس اور استادوں کی کمی سب بہت بڑی رکاوٹیں بنی رہی ہیں ۔ ان سب دقتوں کے باوجود اتنا کام ہو چکا ہے جو اس امر کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ مکمل ہونے کے بعد یہ نظام تعلیم کس قسم کا ہوگا ، اس لیے ہم سب سے پہلے اس چیز پر غور کریں گے کہ اس وقت تعلیم کے بارے میں کیا کچھ کیا جا رہا ہے ، پھر تعلیم کے مستقبل مطلوب کو جانچنے کی کوشش کریں گے ۔

ماسکو کی دوسری سرکاری یونیورسٹی کے صدر البرٹ پی ، پنکوش (Albert P. Pinkevitch) کی کتاب " جمہوریۂ روس میں جدید تعلیم " کو جسے لنڈن میں ولیم اینڈ نارگیٹ لمیٹڈ (Williams & Norgate Ltd.) نے چھاپا ہے ؛ کم و بیش ایک سرکاری بیان کی حیثیت حاصل ہے ۔ اس کتاب کو تعلیمی تنظیم اور اس کے موجودہ مقاصد کے بارے میں مستند سمجھنا چاہیے ۔ اکثر قارئین یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ اس میں کتنی ہی باتیں ایسی ہیں جو مغربی ممالک کی موجودہ صورت سے ملتی جلتی ہیں ۔ لڑکوں کو لکھنا پڑھنا اور حساب سکھانا ایک ایسا فنی کام ہے جو اقتصادی نظام سے چنداں متاثر نہیں ہوتا ۔ جسمانی صحت کا سوال بھی ایک غیر نزاعی مسئلہ ہے ، لیکن ان امور کے علاوہ وہاں سکاؤٹنگ ، اخلاق مدرسہ سکھانے اور بچوں میں حکومت سے وفاداری پیدا کرنے کا نظام بھی رائج ہے جو انگلستان اور امریکہ کے رائج الوقت نظام سے بہت مشابہ ہے اور غیر مانوس اشتمالی انداز تحریر

میں امریکی صدر جامعہ کے مانوس نقطۂ نظر کی روح جھلکتی دکھائی دیتی ہے ، لیکن ان پرانے طریقوں کی صدائے باز گشت کے باوجود بہت کچھ نیا بھی موجود ہے اور جو کچھ نیا ہے وہ بہت ہی اہم ہے ۔ بلا شبہ تمام اشتمالیوں نے اس گہرے تعلق پر واضح طور سے زور دیا ہے جو تعلیم اور سماج میں پایا جاتا ہے اور جس پر صفحات گزشتہ میں زور دیا جا چکا ہے ۔ پنکویش نے مغربی سرمایہ پرست ملکوں کے مدارس کے متعلق لینن کی کتاب سے ایک پیرا نقل کیا ہے :

”ایک متوسط طبقے کی حکومت جس قدر زیادہ مہذب ہوگی وہ اسی قدر زیادہ نفاست سے یہ دھوکا دے گی کہ درسگاہیں سیاست سے آزاد رہ کر ساری قوم کی خدمت کر سکتی ہیں ، لیکن حقیقۃً یہ مدارس متوسط طبقے کے ہاتھ میں جماعتی برتری کا آلۂ کار بنے رہے ہیں ۔ ان مدارس کے رگ و پے میں ذات پات کی روح ہمیشہ جاری و ساری رہی ہے اور ان کا مقصد یہی رہا ہے کہ سرمایہ دار کو اطاعت گزار غلام اور کارآمد مزدور مہیا کرتے رہے“۔

ایک اشتمالی حکومت میں مدرسہ عوام کے ہاتھوں میں جماعتی برتری کا ایک آلہ ہے اور وہاں اس اخلاق تعلیم کے سوا کچھ نہیں جو مزدوروں کو جماعتی کشمکش میں مفید ہو سکے ۔ لینن کا پھر حوالہ دیا گیا ہے :

”ہم ایسے ضابطۂ اخلاق سے انکار کرتے ہیں جو کسی غیر انسانی یا غیر جماعتی تصور پر مبنی ہو اور ہم ایسے اخلاق کو مکر و فریب سمجھتے ہیں جس کا مقصد

سرمایہ داروں اور زمین‌داروں کی خاطر مزدوروں اور کسانوں کے ذہنوں کو مسدود کرنا ہو ۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق جماعتی کشمکش میں مکمل طور پر عوامی مقاصد کے تابع ہے ۔“

اس کا نتیجہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب عوام کو ایسی مکمل فتح حاصل ہو جائے کہ کسی قسم کی جماعتی کشمکش باقی نہ رہے تو پھر اخلاقیات کا نام ہی اڑ جائے گا ، لیکن پنکوش کا خیال ہے کہ ایسے حالات میں ایک زیادہ قطعی ضابطۂ اخلاق ظاہر ہوگا ؛ چنانچہ وہ کہتا ہے :

”سوویٹ روس میں عام تعلیم و تربیت کا مقصد یہ ہے کہ ایک تندرست ، مضبوط ، سرگرم ، دلیر ، آزادی سے سوچنے والے اور عمل کرنے والے انسان کے نشو و نما میں ہر لحاظ سے امداد دی جائے جو معاصر ثقافت کے تمام پہلوؤں سے پورے طور پر آشنا ہو ۔ عوامی مقاصد کے پیدا کرنے اور ان مقاصد کی حفاظت کے لیے اور اس طرح سے آخری تجزیے میں تمام انسانیت کے مفاد کے لیے لڑنے مرنے کے لیے تیار رہے ۔“

اس پیرے میں سے صرف عوام کے بین ذکر کو حذف کر دینے سے ایک مکمل ضابطۂ اخلاق صاف نظر آ جاتا ہے جس میں کوئی چیز امتیازی طور پر اشتمالی نہیں لیکن عبوری دور میں پروپیگنڈے کو بڑا کام کرنا ہے ۔ اس دوران میں گویا مقصد یہ ہے کہ نوجوانوں کو عوامی فلسفے کا معتقد بنایا جائے ۔

پنکوش تسلیم کرتا ہے کہ تعمیر کردار کے زاویۂ نگاہ سے بچپن اور لڑکپن کا زمانہ متفقہ طور پر زندگی کے بہت ہی اہم حصے ہیں ۔ اس کا خیال ہے کہ بعض اداروں میں بچوں کی دیکھ بھال کی جائے جو محض خود ان کی خاطر نہیں بلکہ ایک ایسی اشتراکی حکومت پیدا کرنے کے لیے بھی ہو جس میں عورت ذلیل ، پست اور غیر منفعت بخش محنت سے آزاد ہو کر مرد کے دوش بدوش اپنا مقام حاصل کر لے ۔ اس کا خیال ہے کہ بچپن اور لڑکپن دونوں میں مدرسے کا اثر خاندان کے اثر سے بہتر ہوتا ہے ۔

''معاصر مدارس کے خلاف ہمارا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ انہیں ایسے بچوں سے واسطہ پڑتا ہے جو اپنے اوقات کا تین چوتھائی حصہ حدودِ مدرسہ سے باہر اور اثراتِ مدرسہ سے دور بسر کرتے ہیں ۔ انہیں ایسے بچوں سے واسطہ پڑتا ہے جو ایک خاص نوع کا علم ، خاص طرح کی عادات اور کم از کم ایک خاص قسم کی افتاد طبع ساتھ لے کر آتے ہیں جو دنیا کو ایک خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھتی ہے ۔ بلاشبہ دارالاطفال میں جہاں وہ بچپن یا لڑکپن میں داخل ہوتے ہیں اور جہاں وہ جوان ہونے تک عمر گزارتے ہیں ، ان کی زیادہ مکمل تعلیم ہو سکتی ہے ۔ دارالاطفال میں ہم کسی رکاوٹ کے بغیر ایسی تعلیمی فضا پیدا کر سکتے ہیں جس کی ہم عہد حاضر کے اساتذہ سے تمنا کرتے ہیں ، لیکن عام قسم کے غیر رہائشی مدرسوں میں گھر کے قوی تر اثر اور باقی بیرونی اثرات کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو بے بس پاتے

ہیں ۔"

ان اقتباسات سے سوویٹ حکومت کا نصب العین واضح ہو جاتا ہے ، لیکن سردست اس کی حیثیت نصب العین سے زیادہ نہیں اور صرف چار یا پانچ فی صدی بچے مدرسے جانے کی عمر سے پہلے ان اداروں میں جاتے ہیں ۔ عام لازمی تعلیم فی الحال صرف چار سالوں تک یعنی آٹھ سے بارہ سال کی عمر تک محدود ہے جو پرائمری سکولوں میں گزارے جاتے ہیں ۔

تعلیم کے تمام عرصے کے دوران میں خواہ وہ لمبا ہو یا چھوٹا ، روسی مدارس دوسرے ملکوں کے مدارس سے اس امر میں مختلف ہیں کہ وہ بہت کم علمی ہوتے ہیں اور ان کی توجہ علم سکھانے پر بہت کم مرتکز ہوتی ہے ۔ علم بہ ذات خود مطلوب نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ مدرسے میں بچوں کی زندگی کی تنظیم کا ایک قدرتی اور ضمنی نتیجہ ہونا چاہیے ۔ حق یہ ہے کہ ہمیں اپنے مدرسوں کو زندگی کے مدرسے بنا دینا چاہیے ۔ " مدرسے کے مشاغل کا حقیقت کے ساتھ نہایت گہرا تعلق ہونا چاہیے ، منفعت بخش دست کاریوں کو ممتاز حیثیت حاصل ہونی چاہیے ، مدرسے کا تمام ڈھانچہ ایسا ہو جو سماجی شعور کی نشوونما میں ممد ثابت ہو اور مستقبل کے اشتمالی انقلابیوں کو اشتراکیت کی تربیت دے سکے " مدرسے میں بچے صرف سبق ہی نہیں پڑھتے بلکہ جہاں تک ان کی ہمت اور ہنر کی رسائی ہو ، دست کاریوں میں بھی حصہ لیتے ہیں اور وہ ان کاموں کو تعلیم سمجھ کر نہیں کرتے بلکہ ایک شہری

کے فرائض کے ایک جزو کے طور پر انجام دیتے ہیں۔ جسمانی صحت کو مدرسے میں جو عظیم ترین سیاسی اور سماجی کام سر انجام دینا ہے اس کے متعلق پنکوش یوں لکھتا ہے:

''جب تک جسمانی محنت کو عضلاتی حرکات کی تربیت کے زاویۂ نگاہ سے مفید اور منفعت بخش خیال کیا جائے گا، ہمارے مدارس کبھی ایسے نہ ہوں گے جو اشتراکی یا اشتمالی کہلانے کے حق دار ہوں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے طالب علم اپنے آپ کو مزدوروں کے معاشرے کا ایک رکن اور ایک محنت کش خیال کریں''

روس کے نظام تعلیم کی یہ نہایت ہی اہم خصوصیت ہے۔

پنکوش ہماری ضرورت کے مطابق تفصیل سے نہیں بتاتا کہ طلبہ سے کس قسم کی جسمانی محنت لی جاتی ہے اور ان کے نصاب میں کتنے گھنٹے اس کام کے لیے وقف ہیں۔ وہ کہتا ہے ''فیکٹری، کارخانے میں فی الواقع چیزوں کے بنانے میں مصروف رہنا ان معنوں میں مدرسے کی دستکاری کا ایک حصہ ہے کہ ان کے مشاغل کو مدرسے کے پروگرام میں پیوست کر دیا گیا ہے۔'' دیہاتی علاقوں میں فیکٹریوں کے کام کی جگہ کھیتوں کے کام کو دی گئی ہے؛ چنانچہ جولین ہکسلے (Julian Huxley) درست کہتا ہے:

''اس رابطے کے مقابلے میں جو شہری مدرسوں اور کارخانوں کے درمیان ہو سکتا ہے، دیہاتی مدرسوں کو کھیتوں کے ساتھ ربط دینے کے حق میں بہت کچھ کیا

جا سکتا ہے کیوں کہ زراعت ایک وسیع موضوع ہے اور ایک کارخانہ صنعت صرف ایک خاص شعبے سے سروکار رکھتا ہے ۔ صنعت شہری زندگی سے اتنی ہم آہنگ نہیں جتنی زراعت دیہاتی زندگی سے مربوط ہے ، اس لیے مدرسے کو زراعت کے ساتھ اس طرح جوڑ دینا کہ دونوں ایک ہی ادارے کے اجزائے لاینفک معلوم ہوں، تعلیمی زاویۂ نگاہ سے نہایت مفید ہے''۔

تاہم یہ نقطۂ نظر روس کے ماہرین تعلیم کے نقطہ ہائے نظر سے بنیادی طور پر مختلف ہے جو طلبہ کی جسمانی محنت پر اخلاق ضبط کے پہلو سے غور کرتے ہیں ۔ پنکوش کہتا ہے ,, گو مطالعہ ضروری ہے لیکن زندگی کی عملی سرگرمیوں کا سکھانا کچھ کم ضروری نہیں ۔ اشتراکی مزدوروں کے کسی مدرسے میں یہ سرگرمیاں سماجی اور مفید ہونی چاہییں ۔ کیا ہم ایسے مفید سماجی کاموں کو سماجی نوعیت کے کام خیال کریں جو مدرسے اور طلبہ کے لیے مفید ہوں یا مدرسے کے ایسے کاموں کو جو گرد و نواح میں بسنے والوں کے لیے مفید ہوں ۔ ہمارے انداز خیال نے اس مسئلے کے مفہوم کا انحصار اس تشریح کے مان لینے پر ہے ۔'' یعنی ایسے لڑکوں کی محنت کی حیثیت عام ضروری کام کی ہے نہ کہ خاص کام کی جسے اس کی تعلیمی قدر و قیمت کے پیش نظر منتخب کیا گیا ہو ۔

مدرسے کے مفید سماجی کام کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ؛ اول تبلیغ و اشاعت اور دوم عملی کام ۔ پہلے عنوان کے ماتحت لڑکوں کو مختلف موضوعوں پر

لوگوں کو آبھارنا ہوتا ہے ؛ مثلاً کھیت میں بدل بدل کر فصلیں بونا ، انتخابات میں موزوں ترین آدمی کو ووٹ دینا ، مذہب ، ملیریا ، حشرات الارض ، تمباکو نوشی اور شراب نوشی کے خلاف پرچار کرنا ۔ عملی کاموں میں بھی ایسا ہی تنوع پایا جاتا ہے ؛ بچے اس طرح کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں ، جیسے متعدی جراثیم سے غلے کو فارملین کی مدد سے بچانا ، درخت لگا کر پہاڑی نالوں کے خلاف جنگ کرنا ، کسانوں کے گھروں تک بجلی کی روشنی پہنچانا ، انتخابی لٹریچر تقسیم کرنا ، ان پڑھ لوگوں کو اخبار پڑھ کر سنانا ، طفیلیوں کا خاتمہ کرنا اور ضرورت مند بیوہ عورتوں کی مدد کرنا ۔

سوویٹ مدارس کا مقصد صرف دنیا کو سمجھانا ہی نہیں بلکہ اسے بدلنا بھی ہے ۔ ان کا مقصد جیسا کہ پنکوش لکھتا ہے ، یہ ہے کہ ''مارکس کے نظریے کے مطابق دنیا کی از سر نو تعمیر کی جائے ۔ انفعالی احساس کا سارا تصور ہی اس نظام سے غیر مانوس ہے ۔ اگر ہم منصفانہ طور پر اس نظام کے متعلق رائے قائم کرنا چاہتے ہیں تو یہ خیال ضرور پیش نظر رکھنا پڑے گا''۔

میرا خیال ہے کہ پینتیسویں کل روس کانفرنس نے جو تعلیم ما قبل مدرسہ پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوئی تھی ، مندرجہ ذیل قرار داد منظور کی تھی ۔ یہ قرار داد مارکس کے پیرووں کی حیثیت کے بجائے روسیوں کی حیثیت سے منظور کی گئی تھی :

''موسیقی کو بچے کی زندگی پر مکمل طور پر حاوی

ہونا چاہیے ، کام کرتے وقت اور چھٹیوں کے دوران میں گانا ضروری ہے ، اُستاد کو لڑکے کی ذاتی قوت تخلیق کا خیال رکھنا چاہیے اور آرکسٹرا اور اجتماعی گانے کا بند و بست کر کے انہیں موسیقی کے ضروری تجربے بہم پہنچانے چاہییں"۔

یہ سب کچھ قابل تعریف ہے لیکن میں تسلیم نہیں کر سکتا کہ اشتمالی انقلاب سے انگریزی قوم کو اس قدر موسیقی نواز بنایا جا سکتا ہے۔

اشتمالیت کے خلاف دوسری اقوام کے مخالفانہ جذبات کی وجہ سے جو جنگی ذہنیت روس میں پیدا ہوئی ہے ، اس نے روس کے نظام تعلیم میں بعض ایسے عناصر شامل کر دیے ہیں جو ان عناصر سے جو قومیت نے باقی ممالک میں پیدا کیے ہیں ، بہت زیادہ مشابہ ہیں۔ "نوجوان رہنماؤں" کی تحریک بوائے سکاؤٹ کی نقل میں ان کے آئین اور حلف بھی اسی قسم کے ہیں ، وہ قوانین درج ذیل ہیں :

۱ - "رہنما" مزدوروں کے مقاصد اور لینن کے مواثیق کا سچا حامی ہے۔

۲ - "رہنما" عوام اور اشتمالیوں کا چھوٹا بھائی اور مددگار ہے۔

۳ - "رہنما" دوسرے رہنماؤں ، مزدوروں اور تمام دنیا کے کسانوں کے بچوں کا رفیق ہے۔

۴ - "رہنما" اپنے گرد و پیش کے بچوں کی تنظیم کرتا ہے اور ان کے ماحول میں ان کا شریک کار ہوتا ہے۔ رہنما باقی تمام بچوں کے لیے نمونہ ہوتا ہے۔

۵ - ''رهنما'' علم کے لیے کوشاں رهتا هے ، علم و هنر مزدوروں کے مفاد کی کشمکش میں قوت و طاقت کا سرچشمہ هیں ۔

اس کے علاوہ رهنما سچے دل سے حسب ذیل قسم کھاتا هے :

''میں جو وفاق روس کا ایک نوجوان رهنما هوں، اپنے رفیقوں کے سامنے سنجیدگی سے اس امر کا عہد کرتا هوں کہ (۱) میں اس کشمکش میں جو دنیا بھر کے مزدوروں اور کسانوں کی آزادی کے لیے جاری هے، مستقل مزاجی سے محنت پیشہ طبقے کے مفاد کی حمایت کروں گا اور (۲) میں راسخ بازانہ طور پر بلا پس و پیش لینن کے مواثیق اور نوجوان رهنما تحریک کے ضوابط کی پابندی کروں گا''۔

اگرچہ همیں صریحاً بتایا جاتا هے حکومت روس اخلاق تعلیم کی قائل نہیں ۔ ان آئین اور مواعید میں اخلاق کی جگہ کہنا چاهیے خود نمائی کی ایک صاف جھلک موجود هے ۔

نوجوان ''رهنما'' کی تصویر جو حصول علم کے لیے کوشاں هے اور باقی بچوں کے لیے نمونہ هے ، مجھے اپنے ایام طفلی کی ''پرهیزگار بچوں کی کتاب'' کی یاد دلاتی هے ۔

جو لوگ روس کے خلاف رجعت پسندانہ پروپیگنڈا سنتے آئے هیں، انھیں یہ سن کر تعجب هوگا کہ جنسی تعلیم کے متعلق روس کا زاویہ انتہا پسندی سے بہت دور هے ۔ پنکوش کہتا هے ''استاد اور والدین کا فرض هے کہ وہ بچے کو جنسی رجحان کے غیر ضروری هیجان سے محفوظ رکھیں''

نوجوان کی توانائی کو ''جسمانی تربیت ، کسرتی کھیلوں دستی محنت ، علمی سرگرمیوں ، تحریک ''نوجوان رهنما'' اور ان تمام سماجی کاموں کی طرف متوجه کرنا چاهیے جن میں جسمانی قوت کی کافی ضرورت هے۔ اگر بچے کی طاقت کو حسب قاعدہ ان سمتوں میں کھپا دیا گیا تو جنسی ترغیبات کی غیر ضروری نشو و نما کے لیے اس میں طاقت نہیں رهے گی'' مخلوط تعلیم کو اس لیے پسند کیا گیا هے که لڑکے لڑکیوں میں جنسی کشش کو کم کیا جا سکے ، جنسی موضوعوں کے متعلق بہت زیادہ واقفیت بهم نه پہنچانی چاهیے کیوں که اگر ایسا کیا گیا تو نتیجه صرف یه هو سکتا هے که جنسی تعلقات کے بارے میں ایک مخرب اخلاق هیجان اور ممکن هے که ایک غیر مفید پاکیزہ رویه پیدا هو جائے۔ وہ اس تجویز کو نہایت نفرت سے ٹھکراتا هے که بچوں کو کتوں ، مرغوں ، جانوروں اور گھوڑوں کو مباشرت کرتے دیکھنے کا موقع دیا جائے۔ وہ کہتا هے ''اگر جنسی موضوعوں کو الگ کر کے ان پر خاص طور پر زور نه دیا گیا تو بچوں اور نوخیز نوجوانوں کی توجه ادھر مبذول نه هوگی'' وہ کہتا هے ''جنسی سوالات کو دوسرے زیادہ دل چسپ اور اهم مسائل کے ضمن هی میں دیکھنا چاهیے'' یه سب کچھ درست هو یا نا درست لیکن ان میں سے کسی چیز کو بھی انقلاب سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ، سوائے مخلوط تعلیم کی حمایت کے جسے مشکل هی سے مخرب اخلاق کہه سکتے هیں۔ جن خیالات کا اظہار کیا گیا هے وہ بہت حد تک برطانوی مدارس کے هیڈ ماسٹروں

کے خیالات سے ہم آہنگ ہیں ۔

روس کے موجودہ دستور سے اشتمالیت کے ماتحت تعلیم کی متوقع کامیابی کا اندازہ لگانا آسان کام نہیں ہے ؛ صرف یہی نہیں کہ بعض اہم پہلوؤں میں حکومت کے منشا کو عملی صورت نہیں دی جاسکی بلکہ زیادہ اہم امر یہ ہے کہ وہ جنگی ذہنیت جو اشتمالیت اور سرمایہ داری کی عالم گیر کشمکش کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے ، مدرسے کی فضا پر یوں چھائی ہوئی تھی کہ یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ اگر تمام دنیا میں اشتمالیت پھیل جائے تو مدرسوں کی نشوونما کس طرز پر ہو ۔ ۱۹۲۰ء کے بعد جب ابھی کچھ نہیں ہؤا تھا ، مجھے روس جانے کا اتفاق ہؤا ۔ اس وقت مجھے تربیتی سکول دیکھنے کا اتفاق ہؤا تھا جن میں بچے ہشاش بشاش تھے اور جسمانی دیکھ بھال نہایت عمدہ تھی ۔ لیکن جوں ہی وہ بولنا سیکھ لیتے انہیں شد و مد سے پروپیگنڈے کے زیر اثر لایا جاتا ۔ میں نے لڑکوں کے مدرسے بھی دیکھے جو سازو سامان کی خطرناک کمی کے باوجود بہترین خدمت سر انجام دے رہے تھے ۔ مجھے یونیورسٹی کے پروفیسروں سے ملنے کا موقع بھی ملا جن کی حالت بالکل اطمینان بخش نہ تھی لیکن بعد کی ترقی کے پیش نظر جس کی مجھے براہ راست اطلاعات پہنچتی رہی ہیں ، میرا یہ ذاتی تجربہ چنداں مفید نہیں ۔

سر دست مذہب اور جنسیات کے بارے میں روس اور مغربی ممالک کے مدرسوں میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا ۔ جس مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے وہ دونوں میں

یکساں نہیں لیکن اس کی تعلیم بالکل ایک ھی جیسے ادعا سے دی جاتی ہے۔ روس میں مغرب کی طرح بعض مسائل ایسے ھیں جنھیں ضرور اندھا دھند تسلیم کرنا پڑتا ہے اور جن کی تنقیدی جانچ پڑتال کی اجازت نہیں دی جاتی۔ یہ درست ہے کہ عیسائی ملکوں کے مذھب کے برعکس روسی مذھب ایسا ہے کہ جن نوجوانوں کو اس کے زیر اثر لایا جاتا ہے وہ جوش و خروش سے اسے قبول کرتے ھیں اور اسے اپنی زندگیوں کی بنا قرار دیتے ھیں۔ یہ درست ہے کہ سمجھ دار لوگ روسی مذھب کو بہتر دنیا پیدا کرنے کا ذریعہ خیال کرتے ھیں اور اس کے عقائد کو کم از کم نفس الامری طور پر عقل و خرد سے دست بردار ہوئے بغیر تسلیم کرتے ھیں۔ اس لحاظ سے مارکس ازم کو وھی فوقیت حاصل ہے جو عیسائیت کو اپنے ابتدائی زمانے میں تھی، لیکن اگر وہ تمام دنیا میں پھیل جائے اور غالب ہو جائے تو کیا یہ فوقیت قائم رہ سکے گی۔ سر دست مارکس ازم اس پر امیدی اور ان مفید سرگرمیوں کے ساتھ وابستہ ہے جو۔ کہ ایک وسیع نیم ویران اور اقتصادی ترقی کے لیے آمادہ ملک کا نتیجہ ھیں۔ کسی زمانے میں امریکہ کی بھی یہی حالت تھی اور وہ اس وقت جمہوریت کا حامی تھا۔ چنانچہ تمام ترقی پسند اھل یورپ کو اس وقت امریکہ اور جمہوریت سے پر جوش لگاؤ محسوس ہوتا تھا اور جن کے ساتھ وہ ایسی خوبیاں منسوب کر رہے تھے جنھیں اب ہم ایک براعظم کے وجود سے پاتے ھیں جو اقتصادی ترقی کے لیے چشم براہ تھا۔ اب اس

طرح کا ایک جغرافیائی اتفاق اشتمالیت کے حق میں مصروف عمل ہے اور ہمیں اس کے اثرات کو منہا کرنے کے بعد ان نتائج کا اندازہ لگانا چاہیے جو اشتمالیت کی وجہ سے صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں واقع ہوں گے ، کیوں کہ وہاں اس طول طویل رجائیت کے پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں جو دور حاضر میں روس کا امتیازی نشان ہے ۔

اگر مارکسی عقیدہ ایسا ہی زہرآلود رہا جیسا آج کل ہے تو کچھ عرصے کے بعد وہ عقلی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بن جائے گا ۔ اس وقت بھی جدید سائنس کے بعض ایسے پہلو ہیں جن کا ان کے مذہب سے ہم آہنگ ہونا اشتمالیوں کو مشکل معلوم ہوتا ہے ؛ مثلاً جوہریہ کے متعلق وہ خیالات جو نظریہ مقادیر میں برقیات کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں ۔ اسی طرح ممکن ہے یہ خیال کہ انسانی کردار کی ہر شے اقتصادی اسباب کا نتیجہ ہے ، ایک دن سائنس سے شدید طور پر متصادم ہو جائے ؛ مثلاً گرم ممالک میں بھس (Hook worm) کی بیماری جسمانی قوت کو بہت کچھ کم کر دیتی ہے اور اس معاملے میں اقتصادیات کو نہیں بلکہ آب و ہوا کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے ؛ علاوہ ازیں مارکس کا سارا فلسفہ جماعتی کشمکش میں ایسی بری طرح الجھا ہوا ہے کہ جب وہ ایک غیر جماعتی دنیا کا تصور پیش کرتا ہے جسے وہ پیدا کرنے کے درپے ہے تو وہ مبہم اور غیر یقینی صورت اختیار کرلیتا ہے ۔ اگر ایک غیر مدلل کامیاب مارکس ازم عیسائیت کا جانشین بن جائے تو ممکن ہے کہ وہ بھی سائنسی

ترقی کی راہ میں اتنی ہی بڑی رکاوٹ ثابت ہو جتنی عیسائیت ہے۔

بہر حال یہ غیر اغلب معلوم ہوتا ہے کہ جو فلسفہ اس وقت اشتمالیت کی کامیابی کا ضامن ہے، وہ اپنی موجودہ صورت میں بھی اپنے زور کو قائم رکھ سکے گا۔ اشتمالیت بذات خود صرف ایک اقتصادی نظام ہے جسے اقتصادی اور سیاسی معیاروں ہی پر پرکھا جائے گا۔ کلاسی مادیت کا مسئلہ اور تاریخ کی اقتصادی توضیح منطقی طور پر نظریۂ اشتمالیت کے لازمی حصے نہیں ہیں۔ اگر آج سے اشتمالیت کو ایک اقتصادی نظام کی حیثیت سے للکارنا چھوڑ دیا جائے تو اس بدعت کو دبانے کی اتنی ضرورت نہیں رہے گی۔ بلا شبہ مارکس اور لینن کا اسی طرح احترام کیا جائے گا لیکن لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا وہ ان کا مقصد نہیں تھا۔ عہد حاضر کی اذعانیت اس کشمکش میں ایک اتفاق حادثہ ہے اور ہم امید کر سکتے ہیں کہ اگر کشمکش کا انجام کامیابی کی صورت میں رونما ہؤا تو یہ خیال آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔

اسی طرح کے خیالات کا جماعتی کشمکش پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سرمایہ دار ممالک میں تعلیم امرا کی زبردستی کے نیچے دبی ہوئی ہے، اس کے برعکس روس میں یہ عوامی بالادستی کے مرض میں مبتلا ہے۔ عوام کے بچوں کو متوسط طبقے کے بچوں سے نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے اور متوسط طبقے کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے حاصل کرنے میں زیادہ دقت پیش آ رہی ہے، لیکن

ایک نسل ھی میں یہ تفریق اٹھ جائے گی کیوں کہ عوام کے بچوں کے بغیر وہاں اور کوئی بچے باقی ھی نہ رھیں گے۔

اس سے بھی زیادہ اہم سوال جس کا تعلق مستقبل سے ھے ، خانگی زندگی کا قطعی خاتمہ ھے ۔ اس امر کی توقع ھے کہ جب مالی حالت نے اجازت دی تو سوویٹ حکومت آھستہ آھستہ زیادہ سے زیادہ بچوں کو تربیتی اداروں میں تعلیم دینا شروع کر دے گی تا کہ انھیں والدین سے معمولی واسطہ رہ جائے یا قطعاً کوئی تعلق نہ رہے ۔ اس نظام کی خوبیوں اور برائیوں پر ایک گزشتہ باب میں بحث کی جاچکی ھے اور اب میں ان کا اعادہ نہیں کروں گا ، لیکن خواہ یہ بات اچھی ھو یا بری ، اغلب یہی ھے کہ ایک مکمل ترقی یافتہ اشتمالی نظام تعلیم کی یہ اھم خصوصیت ھوگی ۔

بہت سی ایسی خصوصیات ھیں جن کے بارے میں اشتمالی نظام حکومت کو اس نظام پر جو سرمایہ دار ممالک میں رائج ھوسکتا ھے ، ترجیح ملنی چاھیے ۔ ان میں سے ایک مسابقت کا خاتمہ اور انفرادی سرگرمیوں کی جگہ سماجی سرگرمیوں کا وجود ھے ۔ یہ درست ھے کہ انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں خال خال ترقی یافتہ مدرسے ایسی کوشش کر سکتے ھیں ، لیکن امتحان کے لیے بچوں کو تیار کرنے کی ضرورت اور بعد از بلوغ کی مسابقانہ کشمکش ان کی راہ میں رکاوٹ ثابت ھوتی ھے ۔ اس کے علاوہ مخصوص مدارس کے تعلیم یافتہ لڑکے اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھالنے میں دقت محسوس کرتے ھیں ۔ یہ ایسی دقت ھے جسے بہرحال برداشت کرنا ہی چاھیے ، لیکن

روسی بچے اس دقت سے بری ہیں - ایک ایسا مدرسہ جو مخصوص فضا پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ لازمی طور پر کم و بیش عام دنیا سے الگ تھلگ رہے گا اور یہ صورت حال قابل افسوس ہے، خواہ یہ ناگزیر بھی ہو۔ روس میں مسابقت نہ صرف مدرسے کی زندگی سے بلکہ روزانہ زندگی سے بھی خارج کردی گئی ہے جس سے ایک ایسے تعاونی جذبے کی تخلیق ممکن ہوگئی ہے جسے مغربی ممالک میں کوئی جانتا ہی نہیں -

دنیا کی روز مرہ زندگی میں مدارس کے شرکت کرنے میں کچھ خطرے بھی ہیں، لیکن میرے خیال میں ان کے اسن کا پلہ تمام برائیوں کے مقابلے میں بھاری ہے - بچوں سے جس کام کی توقع کی جاتی ہے ابھی تک اس کے بارے میں بہت کچھ زیادہ پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے - انہیں بچپن ہی میں اشتمالیت کا مبلغ بنا دیا جاتا ہے جس سے ان میں ایک گونہ آدم بیزاری اور ناگوار خود یقینی کا پیدا ہو جانا یقینی ہے، لیکن یہ ایک اچھی بات ہے کہ نوجوان اپنے آپ کو قوم کا ایک جزو خیال کریں اور یہ احساس رکھیں کہ انہیں حسب استعداد مفید بننا چاہیے - میرا خیال ہے کہ مغرب میں ترقی پسند ماہرین تعلیم کا رجحان بچے میں جذبۂ پندار کو بیدار کر کے اسے یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ خود کو ایک ننھا اشرافی سمجھے جس کی خدمت کرنا بڑوں کے لیے ضروری ہو - اس سے وہ بڑا ہو کر تراجی بن جاتا ہے اور سماجی زندگی کی بندشوں کو برداشت کرنے سے گبھراتا ہے - روسی تعلیم میں یہ نقص نہیں پایا جاتا،

بچے کو ابتدا ہی سے یہ محسوس کرایا جاتا ہے کہ وہ معاشرے کا ایک جزو ہے اور اس کے ذمے قوم کے کچھ فرائض ہیں ۔ اس کی سرگرمیوں کو منظم کر کے اسے اس بات کا احساس دلایا جاتا ہے نہ کہ پند و نصائح سے ۔ روس میں اخلاقی تعلیم کا یہ کرداری پہلو قابلِ تعریف ہے اور اگر شہادت قابل اعتبار ہوسکتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہاں قابل ترین نوجوان بھی اپنے آپ کو قوم کا لاینفک جزو خیال کرتے ہیں ۔ یہ نہیں کہ مغربی ممالک کی طرح وہ اکثر حالات میں غیر مربوط اکائیاں بن کر رہ جائیں جو مایوسی کے طفیل ہرزہ سرا اور خشک مزاجی کی بدولت سفاک بن جائیں ۔ اشتمالیت نے ایک ایسا اخلاق ضبط دریافت کیا ہے جسے عہد حاضر کا نوجوان تسلیم کر لیتا ہے اور ایک ایسا طریق حیات جس کے ماتحت وہ خوش خوش زندگی بسر کر سکتا ہے ۔ سرمایہ دار ممالک اس گتھی کو ناقابل حل سمجھتے ہیں کیوں کہ ان کے ادارے ریاکاری کے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتے ۔

یہ ماننا پڑے گا کہ ان تعلیم یافتہ لوگوں کے زاویۂ نگاہ سے جنھوں نے دولت مندی اور پیچیدہ فیاضی کے زیر اثر قدیم تمدن میں تعلیم پائی ہے ، نظریۂ اشتمالیت میں ایک طرح کا بھونڈا پن اور ناقابل برداشت یکسانیت پائی جاتی ہے ۔ ہر مسئلے کو خواہ وہ کتنا ہی دور کا کیوں نہ ہو ، جماعتی نزاع کی طرف منسوب کرنے سے ہر چیز میں عامیانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور ذہنی بلند ہمتی کا لطف فنا ہو جاتا ہے ۔ خالص سائنس کی

ایک مثال میرے مطلب کو واضح کرنے کے لیے کافی ہوگی ؛ مثلاً وہ قاعدہ لیجیے جس کے ماتحت بعید المسافت ستاروں اور سدیموں کا فاصلہ ماپا جا سکتا ہے ۔ یہ اصول انسانی قوت ایجاد ، صحت استدلال اور درست مشاہدے کا شاہ کار ہیں ۔ جہاں تک مجھے علم ہے جماعتی کشمکش کا اس امر سے کوئی تعلق نہیں کہ آیا ایک خاص ستارے کا فاصلہ ایک سو یا ایک ہزار نوری سال ہے ۔ جب ہم سوچتے ہیں کہ انسان یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہو گیا ہے کہ کون سی بات صداقت کے قریب تر ہے تو اس سے انسانیت کا احترام بڑھ جاتا ہے ۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اشتمالیت علم ہیئت کی تحقیقات کو ممنوع قرار دے دیگی ، بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے فلسفے کو سچے دل سے مان لیا جائے تو سائنسی شوق تحقیق کے تمام سوتے جو ان دریافتوں کی طرف رہ نمائی کرتے ہیں ، خشک ہو جائیں گے ۔ مارکس کا نقطۂ نظر ایک غلط چیز کی اہمیت پر زور دیتا ہے ، ممکن ہے کہ نیوٹن کے کارنامے کے تمام اسباب معاشی ہوں ، لیکن یہ کارنامہ بہ ذات خود اپنے اسباب کے مقابلے میں زیادہ دل چسپ اور اہم ہے ۔ معاشیات کا موضوع بہر حال انسان کو زندہ رکھنے سے متعلق ہے ۔ اگر اس مسئلے کا تسلی بخش حل مل جائے ، جیسا کہ اشتمالیت کے ذریعے ممکن ہے ، تو ہمیں غور کرنے کے لیے کچھ اور موضوعوں اور تاریخ مستقبل کی تعمیر کے لیے کچھ نئے اصولوں کی ضرورت ہوگی ۔ مادگی کسی نعرے کے لیے تو ضروری وصف

ہے لیکن کسی فلسفے کے لیے نہیں۔

جس چیز کو بھی سوچ سمجھ کر تیار کیا جائے گا وہ غالباً غیر موزوں سادگی کا شکار ہوگی، اس سے ایک بیزار کن یکسانیت اور ایک جنوں سا پیدا ہوگا جو بار بار ایک ھی بات سننے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے زندگی خود ان خطرات کا سدباب کر دے؟ بہر حال روس میں ماقبل انقلاب کے باقیات اس قدر موجود ہیں کہ اشتمالیت اپنی منصوبہ بندی سے ایک طویل عرصے تک غیر موزوں سادگی پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اگر تعلیم میں ایسے واضح اور دل چسپ عملی کاموں کی تکمیل شامل نہ ہوئی تو اس سادگی پسندی کا خطرہ بہت زیادہ حقیقی ہوگا۔ دنیا مارکسی کلیے سے کہیں زیادہ بیش قیمت اور متنوع ہے۔ ایک نسل جو "سرمایہ" کے فلسفے کی چار دیواری میں محدود رہی ہو، ممکن ہے کہ وہ مفید، مسرور اور ناقابل تسخیر بن جائے لیکن دانش مند نہیں ہو سکتی اور نہ وہ یہ جان سکتی ہے کہ وہ دانش مند نہیں ہے۔ عقلی لحاظ سے وہ سخت اذعانی اور سطحی ہوگی، لیکن میرے یہ اعتراضات فلسفیانہ زاویۂ نگاہ سے ہیں نہ کہ سیاسی نقطۂ خیال سے۔

سیاسی زاویۂ نگاہ سے (وسیع معنوں میں) اس بارے میں میرا فلسفہ ضرور مختلف ہونا چاہیے۔ اشتمالیت، خاندان اور جنسی مساوات جیسے مشکل مسائل کا حل پیش کرتی ہے۔ یہ حل ممکن ہے ہمیں نا پسند ہو لیکن بہر حال اس سے ہمیں ایک ممکن حل ضرور مل جاتا ہے۔

یہ بچوں کو ایسی تعلیم دیتی ہے جس سے مسابقت کا غیر سماجی خیال تقریباً مکمل طور پر خارج کر دیا گیا ہے، یہ ایک ایسے معاشی نظام کو جنم دیتی ہے جو نظام آقائی و بندگی کا ایک ہی قابل عمل متبادل ہو سکتا ہے۔ یہ مدرسے اور زندگی کی اس مغائرت کو نابود کر دیتی ہے جس کی اصل رہبانیت کہی جا سکتی ہے اور جس کی بدولت مغربی ممالک کا تعلیم یافتہ آدمی روز بروز معاشروں کا ناکارہ فرد بنتا جا رہا ہے۔ یہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کے دلوں میں ایک ایسی امید پیدا کرتی ہے جو بادر ہوا نہیں اور ایک ایسی سرگرمی ہے جس کی افادیت میں انہیں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اگر اس نے دنیا پر اپنا تسلط جما لیا جس کا امکان موجود ہے، تو اس سے ہمارے عہد کی بڑی بڑی قباحتوں کا حل نکل آئے گا۔ ان دلائل کی بنا پر مستثنیات کے باوجود یہ نظام ہماری تائید کا مستحق ہے۔

باب چہاردھم

تعلیم اور معاشیات

عوامی تعلیم میں جو اس وقت مغربی ممالک میں رائج ہے ، ھمیں بعض عناصر ایسے نظر آئے ھیں جنھوں نے ھمیشہ گزشتہ ابواب میں تنقید کی دعوت دی ۔ بعض ایسے لوگ پائے جاتے ھیں جو کہتے ھیں کہ تعلیم بلکہ دوسرے امور میں بھی جو خرابیاں ھیں ان کا سرچشمہ ھارا بڑا اقتصادی نظام ھے ۔ میں اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا؛ ھارا رجحان اس نقطۂ نگاہ کی طرف ھے کہ ھر اقتصادی نظام میں کچھ حماقتوں اور کچھ ھوس اقتدار کا پایا جانا ضروری ھے اور ان میں سے ھر ایک ، ایک مکمل نظام تعلیم کے رائج ھونے کی راہ میں رکاوٹ ثابت ھوگا ۔ پھر بھی بلا شبہ تعلیم پر اقتصادی عوامل کا اثر نہایت گہرا اور اکثر اوقات سطحی طور پر غیر واضح ھوتا ھے ۔ میں اس باب میں کوشش کروں گا کہ مختلف ممالک اور مختلف زمانوں میں معاشی عوامل نے تعلیم پر جو اثر ڈالا ھے ، اسے علیحدہ کر کے دکھاؤں ۔

یورپی تعلیم جب پہلے پہل ازمنۂ مظلمہ کے بعد زندہ ھوئی تو وہ مذھبی رھنماؤں کا امتیازی حق تھی اور آج تک اس کی بعض خصوصیات ایسی ھیں جو املاک یکسانی

کی یادگار ہیں ۔ نشاۃ ثانیہ سے پہلے عام طور پر اشراف بے علم ہوتے تھے ، لیکن پادری اور خصوصیت سے پیشہ ور پادری عام طور پر کافی تبحر علمی کے مالک ہوا کرتے تھے ۔ لاطینی زبان کا تھوڑا سا علم پیشہ ورانہ حیثیت سے ضروری ہوا کرتا تھا لیکن اس قلیل ترین ضرورت کی مقدار زیادہ نہیں ہو سکتی تھی ۔ گیارھویں ، بارھویں اور تیرھویں صدی میں سسلی اور سپین کے ھسپانوی عربوں سے تعلق کی وجہ سے علمی احیا پیدا ہوا اور گو اس تعلق کی وجوہ زیادہ تر معاشی تھیں ، لیکن علوم و فنون پر اس کے اثرات کو زیادہ تر اس غیر جانب دار شوق تحقیق سے منسوب کرنا چاھیے جو معدودے چند افراد میں پایا جاتا تھا ۔ فلسفۂ تعلیم اور ازمنۂ متوسط کے علوم و فنون اس کلیسائی اقلیت کے جوش و خروش کے ممنون تھے جن میں سے اکثر کو اپنی محنت کا کوئی مالی فائدہ نہیں پہنچتا تھا اور اکثر اپنے جرأت آمیز نظریات کی بنا پر کافی بدنام بھی ہوئے ۔ اس تحریک کے لیے راھبوں اور درویشوں کا وجود ضروری تھا لیکن اس کے آغاز کی وجہ صرف علمی تشنگی تھی ۔

اوسط درجے کے اشرافیوں کی تعلیم کے متعلق ، جو کچھ عرصے بعد شروع ہوئی ، یہی کچھ کہا جا سکتا ہے ۔ شہنشاہ فریڈرک ثانی جس سے غیر مذھبی تربیت کی ابتدا شمار کی جا سکتی ہے ، ابتدائے شباب ھی سے مسلمانوں سے میل ملاپ رکھتا تھا اور تمام قابل دریافت معاملات میں

اس کا ذوق تجسس غیر تسکین پذیر تھا ۔ پندرھویں صدی میں اٹلی میں یونانی زبان اور درباری ثقافت کا احیا ھوا جو وھاں سے شمالی اقوام میں پھیلی ، اس کے آغاز کا سبب طلب علم برائے علم ھی کہا جا سکتا ھے ۔ یہ درست ھے کہ یہ محرک جلدی ھی اوجھل ھو گیا اور لاطینی اور کچھ یونانی زبان کا علم شرافت کا امتیازی نشان سمجھا جانے لگا اور یہ لڑکوں پر ٹھونسا جانے لگا ؛ نتیجہ یہ ھوا کہ لوگوں کو اس کا ذوق ھی نہ رھا ۔ بہرحال اس وقت بھی کلاسیکی زبانوں کی تحصیل کا مقصد معاشی ھونے کے بجائے ذوق نمائش تھا کیوں کہ اگر کوئی جاگیردار اکتساب ثقافت میں ناکام رھتا تو اس وجہ کی بنا پر وہ لگان کی وصولی سے محروم نہ ھو جاتا تھا ۔ راھبوں کی طرح اشراف بھی فکر معاش سے آزاد تھا اور اگر جی چاھتا تو افادی مقاصد سے الگ ھوکر صرف لطف اندوزی کے لیے علم سیکھ لیتا تھا ۔

اگرچہ یہ نظریہ کہ علم بذات خود ایک پسندیدہ چیز ھے ، ابھی تک یونیورسٹیوں اور چند سست رفتار فلسفیوں میں جن میں سے ایک میں بھی ھوں ، باقی چلا آتا ھے لیکن بہت سے واقعات کی وجہ سے مقاصد تعلیم کے متعلق مروجہ آرا مکمل طور پر بدل گئی ھیں ۔ ان میں سب سے زیادہ اھم عالمگیر لازمی تعلیم ھے ۔ محسوس کیا گیا ھے کہ اگر لڑکے اور لڑکیاں پڑھنا لکھنا سیکھ لیں تو انھیں ناخواندہ لوگوں کے مقابلے میں بہتر شہری اور زیادہ قابل کارکن بنایا جا سکتا ھے ۔ یہ درست ھے

کہ علمی روایات نے اس مقصد کے حصول میں سیاست دانوں کا راستہ روکا؟ ابتدائی سکولوں میں تعلیم صرف کتابوں تک محدود ہے، گو یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ نیم عملی تعلیم ان مدبرین کے مقاصد کے لیے زیادہ ممد ہو سکتی ہے۔ اس لحاظ سے روسی تعلیم اقتضائے زمانہ کے زیادہ مطابق ہے۔ اس کے باوجود ابتدائی مدارس نے وہ کچھ کر دکھایا ہے جس کے لیے وہ کھولے گئے تھے اور اب ہر مہذب ملک میں یہ مدارس حکومت کا نہایت لازمی آلۂ کار ہیں۔

ایک اور عنصر جس کا رجحان تعلیم کے افادی پہلو کی طرف ہے، سائنس اور صنعت کی ترقی ہے۔ آج کل کے فنی طریق ہائے کار سائنسی علم کے متقاضی ہیں اور نئی ایجادات، دولت اور قومی عظمت دونوں کا سرچشمہ ہیں، اور اس اعتبار سے بھی روس کے سوا باقی تمام ممالک میں قدیم روایات موجودہ عہد کی ضرورت سے مکمل ہم آہنگی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوئی ہیں۔ اگر تعلیم مکمل طور پر افادی مقاصد کے تحت ہوتی تو اب سائنس اور صنعتی تکنیک کا درجہ بلند تر اور ادبی علوم کی حیثیت کمتر ہو جاتی۔ اگرچہ تا حال مکمل طور پر یہ صورت نہیں ہے لیکن آہستہ آہستہ ایسا ہو رہا ہے اور جلدی ہی اس کی تکمیل ہو جائے گی۔

تعلیم پر معاشی اسباب کے اثرات کے متعلق پانچ عنوانوں تحت غور کیا جا سکتا ہے جن پر ذیل میں سلسلہ وار بحث کی جائے گی۔

اول : ہر ریاست جو رقم تعلیم پر خرچ کر سکتی ہے وہ اس کی اقتصادی حالت کے مطابق مختلف ہوتی ہے۔ اگر صنعتی انقلاب کی وجہ سے مغربی ممالک دولت مند نہ ہو چکے ہوتے تو عام لازمی تعلیم کا اجرا ناممکن ہوتا۔ چینیوں کے مغربی معیار اختیار کرنے سے پہلے کسی ملک میں بھی علوم و فنون کو اس قدر احترام کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا جتنا چین میں؛ لیکن چین اتنا دولت مند بھی نہ تھا کہ وہ پانچ فی صدی سے زیادہ آبادی کو لکھنا پڑھنا سکھا سکتا۔ ۱۷۸۰ء بلکہ ۱۸۳۰ء کے انگلستان میں بھی اتنے نئے ٹیکس لگانا بہت بشکل تھا جن سے ہر شخص کو مدرسے کی تعلیم دی جا سکتی۔ اس وقت بھی چند مستثنیات کے سوا ابھی تک تربیتی مدارس کا انتظام ممکن نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس مدرسہ چھوڑنے کی عمر زیادہ کر دینے کو معاشی مشکلات کا باعث خیال نہیں کیا جاتا۔ بے روزگاری اور اصول تابین کے پیش نظر تمام عملی لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ ہر آدمی کا برسر روزگار ہونا باقی آدمیوں کو غریب تر بناتا ہے، اسی لیے قوم کی کسی خاص جماعت کو منفعت بخش کاروبار سے علیحدہ رکھنا ہی قوم کے لیے فائدہ بخش ہے۔ اس بنا پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر بچوں کو زیادہ عرصے تک زیر تعلیم رکھا گیا تو ہم سب زیادہ دولت مند ہو جائیں گے۔ انگلستان میں مدرسے کی عمر کو بڑھانے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ معاشی نہیں بلکہ مذہبی ہیں۔ مختلف فرقے اس بات پر

متفق نہیں ہو سکتے کہ لڑکے اور لڑکیاں اوھام پرستی کا کون سا ٹھپا لگوا کر دنیا میں داخل ہوں ۔

دوم : تعلیم کا اصل مقصد مجموعی پیداوار کا بڑھانا ہے ۔ جن لوگوں نے سب سے پہلے عالم گیر تعلیم کو رواج دیا ، غالباً یہی خیال ان کے دلوں میں سب سے بڑا محرک تھا اور بلا شبہ یہ ایک معقول محرک ہے ۔ ایک ایسی آبادی جو پڑھ لکھ سکے ، ان پڑھوں کے مقابلے میں زیادہ قابل ہوتی ہے ، لیکن پیداوار کو انتہا تک پہنچانے کا محرک فنی تعلیم ، سائنسی تربیت اور تحقیقی کام کے بارے میں اور بھی زیادہ بلا واسطہ طور پر بروئے کار آتا ہے ۔ اگر حکومت برطانیہ کو صحیح مالی تخمینے آمادۂ عمل کرتے تو وہ تحقیقی کام پر جتنا روپیہ صرف کرتی اس کی نسبت بحالات موجودہ کم صرف کر رھی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر سول سروس کے افسروں نے صرف کلاسیکی تعلیم حاصل کر رکھی ہے اور وہ ان تمام باتوں سے ناواقف ھیں جو عہد حاضر کے انسان کو جاننا چاھییں ؟ مثلاً طبی تحقیقات پر غور کرو ، یہ چیز ایک اوسط شہری زندگی کے ابتدائی اور آخری ایام میں قوم پر بوجھ ہوتی ہے لیکن کاروباری زمانے میں مفید ہو جاتی ہے ۔ جو بچے مر جاتے ھیں وہ قوم کا ایک خالص اقتصادی نقصان ھیں ، اس لیے بچپن میں شرح اموات کی کمی سے حکومت کو فائدہ پہنچتا ہے ، یا پھر مثلاً اقتصادی علم الحشرات کے معاملے ھی پر غور کیجیے جو زراعت کے مختلف شعبوں میں فیصلہ کن اھمیت

رکھتا ہے ، لیکن اس شعبے میں سرکاری اخراجات کی
قلیل مقدار کو دانستہ فضول خرچی ہی کہنا چاہیے ۔
میں صنعتی تحقیقات کے ان شعبوں کے بارے میں کچھ
کہنا نہیں چاہتا جو زیادہ واضح اور مشہور ہیں ؛ مثلاً
کیمیاوی رنگ ، بھک سے اڑ جانے والے مادے ، زہریلی
گیسیں وغیرہ ، جن میں کچھ مفید اور کچھ غیر مفید
ہیں ۔ سائنسی علوم کی افادیت سے ابھی تک وہ لوگ
بھی پورے طور پر واقف نہیں جو تعلیم یافتہ خیال کیے
جاتے ہیں ۔ جب ایسا ہو جائے گا تو امید ہے کہ
زیادہ وسیع پیمانے پر سائنسی اوقاف وجود میں آئیں گے
اور ثانوی مدارس کے نصاب میں سائنس کو زیادہ جگہ
دی جائے گی ۔

تقسیم دولت کے نظام کا بھی تعلیم پر نہایت گہرا اثر
ہے ، ان عوامل سے بھی زیادہ گہرا جن پر ہم اس وقت تک
بحث کر چکے ہیں ۔ تقسیم دولت ہی سے قوم کی مختلف جماعتوں
کی تشکیل ہوتی ہے اور جہاں بھی مختلف طبقے پیدا ہوں گے
وہیں مختلف طبقوں کو مختلف طریقوں سے تعلیم دی جائے گی ۔
ایک سرمایہ دار معاشرے میں مزدوروں کو کم سے کم
تعلیم دی جاتی ہے اور جو لوگ علمی پیشے میں شامل ہونا
چاہتے ہوں انھیں زیادہ سے زیادہ ، لیکن ان لوگوں کے لیے
جنھیں شریف آدمی بننا ہے یا تجارت کرنا ہے ، اوسط مقدار کافی
سمجھی جاتی ہے ۔ ایک عام اصول یہ ہے کہ لڑکی اور لڑکا
اپنے والدین ہی کے سماجی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں ، لیکن
جو طلبہ غیر معمولی قابلیت کی بنا پر تعلیمی وظائف حاصل

کر لیتے ہیں ، وہ مزدوری پیشہ جماعت سے ترقی کر کے پیشہ ور جماعت میں شامل ہوتے ہیں ۔ انگلستان میں اس طریقے سے جو بہترین دماغ مزدوری پیشہ لوگوں میں پیدا ہوتے ہیں انہیں سیاسی طور پر ناکارہ بنایا جاتا ہے اور عام طور پر انہیں اس جماعت سے کوئی تعلق نہیں رہتا جس کے ساتھ انہیں اپنی پیدائش کی وجہ سے لگاؤ ہونا چاہیے تھا ۔ اسی لچک کی بنا پر دولت پرست معاشرہ اشرافی معاشرے سے مختلف ہے ۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کیوں کہ ایک دولت پرست معاشرے میں اشرافی معاشرے کی نسبت انقلاب کا احتمال بہت کم ہے ۔

جس اقتصادی نظام کو اس کے مخالف سرمایہ دارانہ نظام کہتے ہیں ، ایک پیچیدہ نظام ہے اور ہمارے مقاصد کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کا تجزیہ کریں ۔ یوں کہنا چاہیے کہ روس کو چھوڑ کر جدید دنیا میں دولت کے تین بڑے ذریعے ہیں : اول زمین کی ملکیت اور قدرتی اجارہ داریاں ، دوم سرقبیلی خاندان کی وارثت ، سوم تجارتی کاروبار ۔ یہ تینوں غیر منفک طور پر مربوط نہیں ہیں ۔ ہنری جارج دوسری اور تیسری صورت کو ہاتھ لگائے بغیر پہلی کو ختم کرنا چاہتا تھا ۔ کیتھولک فرقے کی غیر مذہبی پروہتائی میں پہلی صورت موجود ہے ۔ تیسری بھی شاید باقی رہ سکے لیکن دوسری صورت کا قطعاً خاتمہ کر دیا گیا ہے ۔ سامی اقوام کی مخالفانہ تنقید سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ پہلی اور دوسری صورت کو بچانا ، لیکن تیسری صورت کو ختم کرنا چاہتے ہیں ۔ میرا خیال

ہے کہ اشتراکی تنقید کی زد تجارتی کاروبار کے مقابلے میں زمین‌داری اور وراثت پر بہت زیادہ پڑتی ہے جو نظام اشرافیت کے باقیات میں سے ہیں۔ جہاں صرف تیسرا ذریعہ کامیابی کی کنجی ہو جیسا کہ ہنری فورڈ کی مثال ہے، وہاں یہ امر مشکوک ہے کہ آیا قوم کو مجموعی طور پر اس سے فائدے کے برابر نقصان بھی پہنچتا ہے، اور یقیناً جماعت کا تصور جیسا کہ عام طور پر سمجھا گیا ہے، وراثت سے علیحدہ ممکن ہی نہیں۔ تعلیم میں بالخصوص سب سے اہم بات یہ ہے کہ آسودہ حال لوگوں کے بچوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے، وہ اس تعلیم سے مختلف ہے جو مزدوروں کے بچوں کو دی جاتی ہے۔ امریکہ کا کروڑ پتی طبقہ جو اشرافی طبقے کے آثار باقیہ سے یورپ کے مقابلے میں بہت کم متاثر پذیر ہے، تجارتی کاروبار کو عام طور پر دولت کا بڑا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس کا بچوں کی ذہنیت پر جو اثر پڑتا ہے، وہ اس معاشرے کے اثر سے بالکل مختلف ہے جہاں زمین داری اور وراثت سماجی طور پر دولت کے نمایاں ذرائع ہوں۔ یہ انفرادی کوششوں کی ہمت افزائی کرتا ہے اور اس حد تک مستحسن ہے، لیکن یہ ہمت افزائی مسابقت کی شکل میں ہوتی ہے، اس لیے اس حیثیت سے یہ غیر سماجی ہے۔ ایک زیادہ منصفانہ سماجی نظام کے زیر اثر موجودہ طرز کا مقابلہ نہیں ہوگا اور نہ وہ طبقے ہوں گے جن سے ہم واقف ہیں۔ یہ درست ہے کہ پھر بھی کسی نہ کسی قسم کی مسابقت موجود ہوگی اور ایک لحاظ سے مختلف طبقات بھی ہوں گے لیکن یہ نوعیت اور بہ مفہوم ان سے بہت جداگانہ ہوں گے

جن کے ہم عادی ہیں ۔ اشتمالی معاشرے میں بعض اقتداری عہدے ہوں گے اور بعض ایسے بھی جہاں کام غیر معمولی طور پر خوشگوار ہوگا۔ جو لوگ ان مناصب پر فائز ہوں گے وہ کسی حد تک ان لوگوں کے مقابلے میں بلند تر جماعت سمجھے جائیں گے جن کے اختیارات کمتر اور جن کے فرائض چنداں خوشگوار نہیں اور بظاہر با اقتدار اور زیادہ خوشگوار فرائض والے مناصب کے لیے مقابلہ بھی ہوگا ، لیکن ایک ایسی دنیا میں جہاں وراثت اور آبائی رسوخ کا وجود نہیں ، ہر شخص غیر منصفانہ بہتر تعلیمی مواقع کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی ذاتی خوبیوں کی بنا پر دوسروں سے مقابلہ کرے گا ۔ اگر اس نے اپنے ہمسائے کے مقابلے میں بہتر تعلیم پائی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوگی کہ اس کا باپ اتفاق سے دولت مند واقع ہوا ہے ، بلکہ یہ کہ اس نے اپنے آپ کو حصول علم کے لیے زیادہ موزوں ثابت کیا ہے ۔ ایسے معاشرے میں جماعتی امتیاز کے لیے جو جواز بھی ہوگا اس کا مدار ہر ایک صورت میں ہر شخص کی انفرادی ذاتی قابلیت پر ہوگا ؛ مثلاً ایک ماہر ستار بجانے والا ایک درمیانہ درجے کے ستار بجانے والے کے مقابلے میں ہمیشہ بلند تر سمجھا جائے گا اور اس کی زیادہ عزت کی جائے گی ، خواہ اس کی تنخواہ زیادہ نہ بھی ہو ۔ ایسی عدم مساوات اور مقابلہ ناگزیر ہے ۔ یہ عدم مساوات فطرت اشیا میں موجود ہے اور یہ مقابلہ اس لیے لازمی ہے کہ مشکل کاموں کو وہی لوگ کریں جو ان کے سب سے زیادہ اہل ہیں ، اس لیے بہت زیادہ تعلیم دینے کا مسئلہ

جس پر ہم پہلے باب میں بحث کر چکے ہیں ، ایک مشکل مسئلہ ہے ، لیکن تعلیمی مقابلہ موجودہ صورت کے مقابلے میں اس وقت کم تلخ ہوگا جب اقتصادی لحاظ سے سب برابر ہوں گے اور سب کو نہ صرف اپنی ذات کے لیے بلکہ اپنے بچوں کے لیے بھی معاشی سلامتی حاصل ہوگی۔ عدم مساوات اور عدم سلامتی ہی نے اس وقت مقابلے کو اتنا تلخ بنا رکھا ہے، جب یہ عناصر نکال دیے جائیں گے تو اس کی تلخی جاتی رہے گی ۔

جذبۂ حب وطن کا نجی جائداد کے ساتھ تعلق ہے ، اگرچہ اس میں بعض اور محرک بھی داخل ہو گئے ہیں ۔ یہ تعلق فوری طور پر واضح نہیں اور اکثر افراد کے شعور میں اس کا وجود بھی نہیں ہوتا ۔ یہ ایک پیچ در پیچ تعلق ہے جو سرمایہ داری کی بعض سفاک صورتوں نے پیدا کیا ہے ۔ غیر ترقی یافتہ ممالک روپیہ لگانے والے انسان کے زاویۂ نگاہ سے دو لحاظ سے مفید ہو سکتے ہیں ، یعنی بطور منڈی کے اور خام مال کا منبع ہونے کے لحاظ سے ۔ دونوں صورتوں میں یہ ممالک اس وقت زیادہ مفید ہوتے ہیں جب وہ اس ملک کے زیر اقتدار ہوں جو روپیہ لگانے والے کا وطن ہے ۔ فرانسیسی سرمائے کے لیے شمالی افریقہ ، انگریزی سرمائے کے لیے ہندوستان اور امریکی سرمائے کے لیے وسطی امریکہ بہترین مقام ہیں ۔ اس طریقے سے جو روپیہ لگانے والا اپنے وطن سے باہر روپیہ لگانے کا خیال کرتا ہے اسے علاقائی لحاظ سے نہ سہی معاشی لحاظ سے ضرور شہنشاہیت سے دل چسپی ہو جاتی ہے

اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اگر قومیت کی موزوں تبلیغ کی جائے تو اس کے کاروباری اخراجات کا ایک معتدبہ حصہ ٹیکس ادا کرنے والے کے کندھوں پر ڈالا جا سکتا ہے۔ یہ ہے اکثر طاقت ور قوموں کے جذبۂ قومیت کا سرچشمہ، گو ان عام شہریوں کو جو قومي جھنڈے کی جے کے نعرے لگاتے ہیں، ان ناپاک ارادوں کا علم نہیں ہوتا جو انہیں ایسا کرنے پر اکساتے ہیں۔ کمزور اقوام کا جذبۂ قومیت غارت‌گر اقوم کے خلاف ایک تدبیر دفاع ہے۔ جب تک وہ غارت‌گری کرنے کے بجائے غارت‌گری کے خلاف لڑ رہی ہوتی ہیں، وہ وقتی طور پر زبردست اقوام کے مقابلے میں اخلاقی طور پر بہتر ہوتی ہیں، لیکن ایک کمزور قوم کے دل میں جو آزادی کے لیے لڑ رہی ہو، کچھ ایسے جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ جوں ہی وہ کامیاب ہوتی ہے تمام وہ برائیاں جنھیں وہ زبردست اقوام میں نا پسند کرتی ہے، خود اس میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پولینڈ نے تقریباً دو سو سال کی غلامی کے بعد آزادی حاصل کی، لیکن جو بوجھ اس نے خود اٹھا رکھا تھا اسے اہل یوکرین کے کندھوں پر بے تکلف منتقل کر دیا۔ جذبۂ قومیت بطور اصول قابل نفریں ہے، اس لیے یہ ان قوموں میں مستحسن نہیں جو آزادی کے لیے لڑ رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ قوموں کو جبر کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں قومی نقطۂ نگاہ کے بجائے بین‌الاقوامی نقطۂ نگاہ سے دفاع کی لڑائی لڑنی چاہیے۔ قومیت کی قباحتوں کا تعلق خواہ وہ

طاقت‌ور اقوام میں ہو یا کمزور اقوام میں ، ذاتی جائداد سے ہے ۔ ان مصائب کا تعلق یا تو استحصال سے ہے یا استحصال کے تدارک سے ، اس لیے یہ خیال معقول ہے کہ اگر ذاتی سرمایہ خرچ کر دیا جائے تو قومیت تعلیم میں سردست جو ناپاک کردار ادا کر رہی ہے ، گو وہ سرے سے ختم نہ بھی ہو لیکن کافی حد تک کم ہو جائے گا ۔

تعلیم پر اقتصادی اثرات کے سلسلے میں چوتھا عنوان جس پر ہم غور کرنا چاہتے ہیں ، اوقاف ہیں ۔ جن ممالک میں یہ ذریعہ وصیت ہبہ کرنے کی آزادی ہے وہاں ایک آدمی اپنی جائداد کسی ایسی چیز کے نام جو مفاد عامہ کے خلاف نہ ہو ، وقف کر سکتا ہے ۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے انگلستان میں مذہبی عقلیت کی تبلیغ کے لیے وصیت کالعدم سمجھی جاتی تھی ۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی تھی کہ ایک عیسائی ملک میں مذہبی عقلیت مفاد عامہ کے خلاف ہے ، لیکن اب یہ صورت نہیں رہی ۔ اگرچہ ترقی پسند مقاصد کے لیے اوقاف کی حیثیت غیر قانونی نہیں ، لیکن یہ لازمی ہے کہ اوقاف زیادہ تر ایک قدامت پسند طاقت ہی رہیں گے اور اکثر ایسے لوگوں کی خواہشات کا پیکر ہوں گے جنھیں مرے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں ۔ گرجے ، پرانی یونیورسٹیاں اور بہت سے سکول بیشتر یا یا کم تر حد تک پرانے اوقاف پر انحصار رکھتے ہیں ۔ امریکہ میں اوقاف زیادہ تر قریب العہد ہیں ، لیکن وہ جہاں کہیں بھی ہیں ، بڑے بڑے کروڑ پتیوں کے عطیات ہیں جو لازماً قدامت پرست اور عموماً ناخواندہ ہوتے ہیں ۔

اسی لیے وہ تعلیم میں ترقی پسند تحریکات کو روکنے میں کافی موثر ثابت ہوتے ہیں ۔ ایک ایسی یونیورسٹی کا صدر جس کے پروفیسروں پر انتہا پسندی کا شبہ ہو ، انسانیت دوست کروڑ پتیوں سے عطیات لینے میں غالباً کم کامیاب ہوگا ، بہ مقابلہ اس کے جس کے رفیقان کار نظام موجودہ پر قانع ہوں ۔

تعلیم کے مذہبی پہلو کو قدامت پرست بنانے میں اوقاف کو کافی دخل حاصل ہے ۔ مذہب کا تعلق ذاتی جائداد سے اس بنا پر ہے کہ لوگ اپنا سرمایہ مذہبی اداروں کو دے جاتے ہیں اور اس طرح ان کی موت کے صدیوں بعد تک ان خاص اوہام کی اشاعت ہوتی رہتی ہے جن کے وہ قائل تھے ۔ یہ درست ہے کہ انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ میں اس چیز کو قانون سے بدلہ جا سکتا ہے ۔ اصلاح مسیحیت کے موقع پر جو جائدادیں ازمنۂ متوسط کے مقدسین چھوڑ گئے تھے ، وہ اصل مقصد سے ہٹا کر کلیسائے انگلستان کی تعلیمات کی تبلیغ کی طرف پھیر دی گئیں ۔ جب سکاؤٹ لینڈ کے آزاد کلیساؤں کی جائداد قانونی طور پر وی فری (Wee Frees) فرقے کے نام پر منتقل ہو گئی تو قانون میں بھی تبدیلی کی گئی تاکہ متعصب جبریوں کی وصیتیں ایسے عقائد کی تبلیغ میں صرف کی جا سکیں جن سے قدریوں کا خاتمہ کر دیا گیا تھا ، لیکن امریکہ کا دستور ایسی تبدیلیوں کا مخالف ہے ؟ مثلاً اگر تم اپنی جائداد ایک ایسے ادارے کے لیے وقف کر جاؤ جو اس عقیدے کا پرستار ہو کہ کنٹکی (Kentucky) کے باشندے دس گم شدہ

قبیلوں میں سے ہیں تو وہ روپیہ اس مصرف سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ۔ اگرچہ انگلستان میں یہ تبدیلی ممکن ہے لیکن بہت کم ۔ کلیسائے انگلستان اور رومن کیتھولک کلیسا بڑے دولت مند ادارے ہیں ۔ ان کی آمدنی صرف ان لوگوں کے ہاتھ لگ سکتی ہے جو موزوں عقائد کے قائل ہوں ، اس لیے عقائد اسلاف کی تسلیم کے نہایت موثر اقتصادی محرک موجود ہیں ، ہر عقلی ترقی کے لیے ایک اقتصادی سزا موجود ہے ۔ جب کولینسو (Colenso) نے یہ دریافت کیا کہ خرگوش جگالی نہیں کرتا تو اس کی تنخواہ میں تخفیف کر دی گئی تھی ۔

اگر مذہبی اوقاف نہ ہوتے تو بلا شبہ یہ حالات موجودہ حالت کی نسبت کہیں جلدی تبدیل ہو جاتے ؛ پھر بھی جیسا کچھ بھی ہے ، یہ حالات ظاہری شکل کی نسبت اصلاً زیادہ تیزی سے بدلتے ہیں ۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنھیں کلیسائے انگلستان کے پادریوں کو ماننے کا اقرار کرنا پڑتا ہے ، گو انھیں یہ کہنے کا اختیار ہے کہ یہ صرف زبانی اقرار ہے اور اگر وہ ایسا کہہ بھی دیں تو کوئی انھیں برا نہیں سمجھتا ۔ عیسائی مجموعۂ عقائد کے بعض حصے ایک وقت زندہ ہوتے ہیں اور بعض کسی اور وقت ۔ مثلاً آج کل اکثر عیسائیوں کا خیال ہے کہ حضرت مسیح ؑ نے طلاق کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کے لفظی معنی لینے چاہئیں ، لیکن عدم مقاومت قسم کھانے سے احتراز اور غریبوں میں دولت کی تقسیم وغیرہ کے معاملات میں ان کے اقوال کی تشریح مجازی طور

پر ہونی چاہیے ، یعنی ان کا مطلب الفاظ کے برعکس ہونا چاہیے، لیکن یہ سوال کہ ایک عیسائی کو حضرت مسیح[۴] کی تعلیم کے کون کون سے حصے قبول کرنے کی اجازت ہے ، ایک پیچیدہ سوال ہے جس کے متعلق اور کچھ نہیں کہوں گا ۔

تعلیم پر اقتصادی اثرات کے سلسلے میں پانچواں عنوان روایت ہے ۔ میرا مقصد عام روایت نہیں کیوں کہ وہ مفہوم بہت وسیع ہے ۔ میرا مقصد وہ روایت ہے جو کسی ایسی اقتصادی وجہ کی بنا پر مستنبط کی گئی ہو جو زمانۂ گزشتہ میں اثر انداز رہی لیکن اب مؤثر نہیں ۔ جنسی اخلاق جو عموماً بہت ہی قدامت پرست واقع ہوئے ہیں ، اس سلسلے کی بہترین مثال ہیں ۔ گزشتہ زمانے میں جب دنیا کی آبادی بہت کم تھی اور بچوں کی شرح اموات زیادہ ، تو جوڑے (والدین) زیادہ بچے پیدا کر کے انسانیت کی خدمت بجا لاتے تھے، جب تک جبری تعلیم کے اجرا اور جسمانی محنت کی مخالفت نے بچوں کو مالی بوجھ نہیں بنا دیا تھا ، اس وقت تک وہ اکثر والدین کے لیے مالی فائدے کا سبب ہوا کرتے تھے ۔ ان دنوں برتھ کنٹرول اور اسقاط حمل کی مخالفت کا معقول اقتصادی جواز موجود تھا جو اب موجود نہیں ، لیکن مخالفت کا وہ جذبہ تاحال موجود ہے کیوں کہ وہ مذہب سے وابستہ ہو چکا ہے ۔

پدر قبیلی خاندان کی اساس واضح طور پر اقتصادی تھی ۔ چونکہ عورتیں حمل اور رضاعت کے دوران میں کامیابی سے شکار نہیں کر سکتی تھیں ، ابھی زمانۂ حال تک

عورتوں کے لیے آزادانہ حصول معاش کا کوئی موقع نہ تھا اس لیے مجبوراً وہ اپنے خاوندوں یا مرد رشتہ داروں کی دست نگر تھیں ۔ سر قبیلی خاندان نے جو بیویوں کی کفالت اور اولاد نرینہ کی جانشینی پر مشتمل تھا ، فطری طور پر بیویوں کی نیک چلنی پر اصرار کیا اور سخت اخلاق اور مذہبی سزاؤں کے زور پر اسے رواج دیا ، یہاں تک کہ ابتدائی تمدن میں عورتوں کو زنا کے جرم میں قتل کی سزا دی جاتی تھی ۔ گو قانونی سزا نرم ہو گئی اور آخرکار سوائے چند دور افتادہ علاقوں ، مثلاً نیویارک ریاست کے ختم ہو گئی، مگر اخلاق اور مذہبی لعن‌طعن باقی رہی۔ روایاتی ضابطے کا یہ حصہ نظری طور پر نہ سہی عملی طور پر لازماً مردوں اور عورتوں کے نظریۂ مساوات کے منافی ہے۔ جہاں عورتیں خود اپنی روزی کما سکتی ہیں، وہاں ان کے دعوائے مساوات کو رد نہیں کیا جا سکتا ۔ دیوانہ وار کوششیں کی جا رہی ہیں کہ شادی شدہ عورتوں کو روزگار نہ دیا جائے ، لیکن امید نہیں کہ یہ کوششیں مستقل طور پر بہت زیادہ کامیاب ہوں گی ۔ نیز کثرت سے ایسے ذرائع نکل رہے ہیں جن کی بدولت ایک عورت روایتی نقطۂ نظر کے مطابق پاک دامن نہ ہوتے ہوئے بھی روزی کما سکے ، اس لیے موجودہ اخلاق ضابطہ اقتصادی اسباب کی وجہ سے ٹوٹتا چلا جا رہا ہے ۔ شرح پیدائش کی کمی عسکریت کے ساتھ مل کر حکومت کو بچوں کی بہبود میں کافی دل چسپی لینے پر مجبور کر رہی ہے ، کیوں کہ حکومت کے زاویۂ نگاہ سے مذکر بچے کا اس وقت سے پہلے مر جانا ، اسراف کے مرادف ہے

جب تک وہ کافی بڑا ہو کر میدان جنگ میں مارے جانے کے قابل نہ ہو۔ جہاں اقتصادی وجوہ مل کر عورتوں کی نیک چلنی کی اہمیت کو کم کر دیں اور بچوں کی پرورش پر حکومت کا حصہ زیادہ ہونے لگے، وہاں ظاہر ہے کہ باپ کی اہمیت بہت کم ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ھی وہ اخلاق پند و نصائح بھی کمزور پڑ جائیں گے جو سر قبیلی خاندان سے مربوط ہیں۔ موجودہ حالات میں حکومت اور والدین بچوں کے لیے یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ جنسی معاملات میں انہیں ایسا نقطۂ نظر سکھایا جائے جو گزشتہ روایات کے مطابق ہو اور جو موجودہ زمانے کے لیے مناسب حال نہ ہو۔ یہ مثال ان جذبات کی قدامت پرستی کی ہے جن کا تعلق جنسیات اور خاندان سے ہے۔ تعلیم کے بارے میں یہ قدامت پرستی بالخصوص سخت ہے، کیوں کہ اکثر لوگ اس خیال کے ہیں کہ اخلاق اصول کی کڑی تعلیم دینے سے بچوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اس لیے تعلیم کا رجحان یہ ہے کہ انسانی معاشروں کو نئی ضروریات کے مطابق ڈھانے سے روکا جائے اور بہت سے بالغ مرد اور عورتیں بچپن کی تربیت کی وجہ سے ایسی چیزوں کے ماننے سے گھبرا اٹھتی ہیں جنھیں مسلمہ سمجھ کر مان لینا ھی بہتر ہوتا ہے، کیوں کہ اقتصادی وجوہ نے اس جنسی اخلاق کی نشو و نما میں حصہ لیا ہے جو مدارس میں سکھایا جاتا ہے اور وہ اسباب گزشتہ زمانے سے متعلق ہیں، اس لیے عہد حاضر کی اقتصادی ضرورتوں کے لیے ان کا کوئی جواز نہیں۔

اگرچہ وہ اقتصادی وجوہ جو ذاتی جائداد سے متعلق ہیں ، تعلیم کو قدامت پسند رکھنا چاہتی ہیں لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا اشتمالیت کے ماتحت جب ایک دفعہ زمانۂ انقلاب ختم ہو جائے تو قدامت پرستی کچھ کم ہو جائے گی ۔ اس وقت یہ نظام مکمل طور پر ایک متحدہ دفتری حکومت کے ماتحت ہوگا اور عام طور پر ضابطہ پرست حاکم تبدیلی کے بہت خواہاں نہیں ہوتے ۔ ممکن ہے اس وقت فوری تبدیلی کی ضرورت موجودہ وقت کے مقابلے میں کم ہو ، شاید انسان اس وقت ایک امن پسندانہ دور استحکام کی بدولت بہتر بن جائے ؟ بہر حال جو کچھ بھی ہو، مسابقت کے بجائے تعاون کو نظام تعلیم کا نصب العین قرار دینا ایک ٹھوس اخلاق پیش قدمی ہوگی جو نظام تعلیم میں صرف مکمل تبدیلی ہی سے ممکن ہو سکتی ہے ۔ صرف اسی ایک بنا پر یہ توقع رکھنا جائز ہے کہ مغرب موجودہ نظام کی موجودگی میں جس قسم کے مرد اور عورتیں پیدا کر رہا ہے ، ان کے مقابلے میں اشتمالیت کے ماتحت تعلیم بہتر مرد و زن پیدا کرے گی ۔

باب پانزدہم

تعلیم میں پروپیگنڈا

پروپیگنڈے کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک ایسی کوشش ہے جس سے انسانوں کو کسی مختلف فیہ معاملے میں ترغیب دے کر ایک خاص گروہ کی حمایت پر آمادہ کیا جا سکے۔ پروپیگنڈے اور جبر میں طریقِ کار کے لحاظ سے فرق ہے، کیونکہ یہ طریق ایسا ہے جس میں طاقت نہیں استعمال کی جاتی اور پروپیگنڈے اور تعلیم میں نصب‌العین کا فرق ہے، کیونکہ یہاں علم کی تبلیغ نہیں ہوتی بلکہ ایک طرح کا جماعتی احساس پیدا کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ مقاصد کے سوا اور کسی اور شے میں مختلف نہ ہو کیونکہ ہو سکتا ہے (اگرچہ یہ چیز شاذ ہے) کہ یہ بالکل درست معلومات پر مشتمل ہو، لیکن پھر بھی وہ ایسی معلومات پر مشتمل ہوگا جن کا رجحان ایک خاص سمت کو ہو، اور جن معلومات کا رخ مخالف سمت کو ہوگا وہ بالکل نکال دی جائیں گی۔ مدحیہ قصیدے اور ہجویہ چیزیں جو سائنسی نفسیاتی تجزیے کی ضد ہیں، دونوں پروپیگنڈے میں شامل ہیں؛ اگرچہ اکثر آدمیوں میں اتنی خوبیاں یا اتنے نقائص پائے جا سکتے ہیں کہ مدح یا ہجو دونوں کو جھوٹ کا سہارا ہی نہ لینا پڑے۔ ایسی

طرح کسی قوم کی تاریخ دوستانہ یا مخالفانہ زاویہ ھاے نگاہ سے لکھی جا سکتی ھے اور دونوں صورتوں میں انسان اپنے آپ کو درست بیانات تک محدود رکھ سکتا ھے ، لیکن جو تاثرات پڑھنے والا اخذ کرے گا وہ غلط ھوں گے ، جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ ھوگی کہ بعض چیزوں کو نظر انداز کر دیا گیا ھے ۔

ھر قسم کی تعلیم میں پروپیگنڈے کو دخل ھے ۔ کوئی بالغ بھی اپنی پسند یا نا پسندی کے اظہار سے رک نہیں سکتا اور بچوں کے سامنے اس قسم کا ھر اظہار پروپیگنڈے کا اثر رکھتا ھے ۔ اب پڑھانے والے کے سامنے یہ سوال نہیں کہ آیا پروپیگنڈا ھونا چاھیے یا نہیں بلکہ یہ کہ کتنا ھو ، کیسے منظم کیا جائے اور کس قسم کا ھو اور آیا تعلیم کے دوران میں کسی مرحلے پر لڑکے لڑکیوں کو بےلاگ رائے قائم کرنے کے طریقے سکھا کر پروپیگنڈے کے اثرات سے حتی الامکان پاک کرنے کی کوشش کرنی چاھیے ؟

تجدید مسیحیت کے وقت سے تعلیم میں پروپیگنڈے کا اثر متواتر بڑھتا چلا آ رھا ھے ۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے اس کی تکنیک کی تکمیل کی وہ جیسیوٹ (Jesuits) فرقہ تھا جس نے تجدید مسیحیت کی مخالفت میں جو کامیابی حاصل کی تھی اس کو تعلیم پر قبضہ کر کے پائدار بنانا چاھا ، لیکن پروٹسٹنٹ بھی بہت پیچھے نہ تھے ۔ مثلاً انگلستان میں سپین کی عدالت احتساب سمتھ فیلڈ کی آگ اور بارود کی سازش سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ۔ سترھویں صدی کے مقابلے میں اٹھارھویں صدی میں انقلاب فرانس

کے آغاز تک فضا پر سکون اور پروپیگنڈے سے کافی حد تک محفوظ رہی ۔ اٹھارھویں صدی کی لڑائیاں بلحاظ نتیجہ اہم ہونے کے باوجود بہت خون‌خوار نہ تھیں اور متخاصمین کے ایک دوسرے کے احترام کرنے میں مانع نہ ہوئیں ، لیکن انتہائی حریت پسندی کی وجہ سے اہلِ یورپ کی طبائع زیادہ سخت ہو گئیں اور نپولین کے خلاف لمبی لڑائیوں کی وجہ سے انگریز تنگ نظر اور جرمن محب وطن بن گئے ؛ چنانچہ اس وقت سے اب تک ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے درمیان کشمکش تلخ سے تلخ تر ہوتی گئی اور عام مردوں اور عورتوں کی زندگی میں قومیت نے زیادہ سے زیادہ حصہ لیا ۔ زمانۂ حال میں مختلف سیاسی جماعتیں نہ صرف اپنے اعتقادیات کی بنا پر بلکہ اپنی واقفیت اور ناواقفیت کی وجہ سے مشہور لوگوں کے بارے میں اپنی رائے کے سبب سے اور مستقبل کے بارے میں امید و بیم کی بنا پر مکمل طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئی ہیں ۔

دنیاے جدید میں جو تقسیم موجود ہے ، اولاً پروپیگنڈا اس کا نتیجہ اور ثانیاً اس کی علت ہے ۔ تجدید مسیحیت سے پہلے یورپ میں ایک طرح کا اتحاد موجود تھا ؛ جو کچھ ملحد موجود تھے ان کے ساتھ تو سزاؤں سے نپٹ لیا جاتا اس لیے جدید معنوں میں پروپیگنڈے کی ضرورت نہیں تھی ؛ اس کے بر عکس مذہبی لڑائیوں کے دوران میں فتح و شکست کا انحصار دوسروں کو اپنا ہم مذہب بنانے کی استعداد پر تھا ۔ انقلابی لڑائیوں میں فرانس کی فتح کا مدار زیادہ تر اس جوش و خروش پر تھا جو جمہوریت کے پروپیگنڈے

کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا ۔ اشتراکیت اور اشتمالیت کی تعمیر مکمل طور پر پروپیگنڈے سے ہوئی ۔ اگر قومیت کا پروپیگنڈا نہ کیا جاتا تو اقوام عالم جنگِ عظیم کی قربانیوں کی تاب نہ لا سکتیں ۔

عالم گیر تعلیم نے پروپیگنڈے کے مواقع غیر محدود طور پر بڑھا دیے ہیں ۔ صرف یہی نہیں کہ ہر جگہ تعلیم خود ہی پروپیگنڈے کی علم بردار ہے بلکہ پڑھنے کی استعداد تمام آبادی کو اخبارات سے اثر پذیر ہونے کے قابل بنا دیتی ہے ۔ یہی بڑی وجہ تھی کہ گزشتہ جنگ تمام سابقہ لڑائیوں کے مقابلے میں زیادہ تلخ تھی ۔ جن لوگوں نے پڑھنا سیکھ لیا تھا اور اس کے سوا اور کچھ نہ سیکھا تھا وہ مظالم کی کہانیوں سے متاثر کیے جا سکتے تھے ، حالانکہ پہلے زمانے میں اکثر لوگ یا بالکل ناخواندہ تھے یا بہت زیادہ پڑھے لکھے اور دونوں صورتوں میں وہ مقابلتاً محفوظ تھے جیسا اس مثال سے واضح ہے ۔ پروپیگنڈے کو اب وہ اہمیت حاصل ہے جو پہلے کبھی نہ تھی ۔

پروپیگنڈے کی بڑی صورتیں تین ہیں ۔ (۱) سیاسی جماعتوں کے حق میں (۲) مذہب کے حق میں (۳) اور قوموں کے حق میں ۔ ان میں سے پہلی صورت کو ریاست علانیہ اپنے ذمے نہیں لے سکتی ، لیکن وہ بہت ہی چھوٹی جماعتوں کے خلاف پروپیگنڈے میں مشغول ہو سکتی ہے ؛ مثلاً امریکہ اور انگلستان میں اشتمالی جماعت کے خلاف عموماً سیاسی جماعتوں کے حق میں پروپیگنڈا تعلیم کے دوران میں نہیں کیا جاتا ۔ بلا شبہ دولت مندوں کے مدارس کی

فضا قدامت پسندانہ ہوتی ہے، لیکن اکثر بچے بہر حال بڑے ہو کر قدامت پسند ہی ہوں گے، اس لیے جماعتی پروپیگنڈے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مدارس میں مذاہب اور اقوام پروپیگنڈے کے مناسب موضوع خیال کیے جاتے ہیں۔ رومن کیتھولک اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ ان کے بچوں کو رومن کیتھولک مدارس ہی میں تعلیم دی جائے۔ پروٹسٹنٹ ایک ایسی نرم سی مذہبی فضا کو ترجیح دیتے ہیں جو قریب قریب ان کے عقائد کی آئینہ داری کرے۔ ہر بڑی قوم جذبۂ قومیت کو سرکاری مدارس میں جاری و ساری کر دیتی ہے اور اس چیز کو اوسط شہریوں کی تعلیم کا نہایت قیمتی جزو سمجھتی ہے۔ اشتمالیت کے تحت قومیت کی تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ وہاں اشتمالیت کے حق میں اور یہ بتانے کے لیے زبردست پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ جمہوریہ روس ہی اس کی پناہ گاہ ہے۔ یہ امر مشکوک ہے کہ آیا بچوں کے دلوں میں اس کا جو اثر پیدا ہوتا ہے وہ اس جذبۂ قومیت سے کچھ زیادہ مختلف ہے جو سرمایہ دار ملکوں میں تعلیم کے ذریعے پیدا کیا جاتا ہے۔

جب تک ناکامی کی کوئی خاص وجہ نہ ہو، تعلیم میں پروپیگنڈا عام طور پر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی ایک بڑی اکثریت اس مذہب کو جس میں ان کی پرورش ہوئی ہو اور اس وطنیت کو جو مدارس میں انھیں سکھائی جائے، قبول کر لیتی ہے۔ امریکہ میں آباد ہونے والے تارکان وطن کے بچے وطن پرست امریکی بن جاتے ہیں اور عام طور پر اپنے والدین کے اصلی وطن سے

نفرت کرنے لگتے ھیں ۔ یہ زیادہ تر مدارس کا اثر ھے ؛ صرف ایک چیز ھی ایسی ھے جو قومیت کے پروپیگنڈے کو ناکام بنا دیتی ھے اور وہ ھے لڑائی میں شکست ۔ بہت سے روسی ۱۹۱۷ء میں اور بہت سے جرمن ۱۹۱۸ء میں محب وطن نہیں رھے تھے ، لیکن آخر الذکر کی بیشتر تعداد معاھدہ و رسائی کے اثر سے بین الاقوامیت چھوڑنے پر مجبور ھو گئی ۔ پروپیگنڈا عام طور پر ناکام نہیں رہ سکتا جب تک وہ لوگوں کو کسی ایسی چیز کے منوانے کی کوشش نہ کرے جس سے انہیں آغاز ھی سے نفرت ھو ؛ چنانچہ یہ ممکن نہ ھو سکا کہ جنوبی آئرلینڈ کے لوگوں کو برطانوی جذبۂ قومیت سے سرشار کیا جائے یا انہیں پروٹسٹنٹ مذھب اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے ۔ اگر پروپیگنڈے کو کامیاب ھونا ھے تو کوئی ایسی چیز دل نشین کرانی چاھیے جس کی خواھش فطری ھو ۔ ایسی صورت میں وہ اجتماعی احساس کی شدت کو بے حد بڑھا سکتا ھے ، جہاں پہلے ھی سے جذبات نفرت موجود ھوں وہ انہیں تیز تر کر سکتا ھے ، جہاں ضعیف الاعتقادی کے احساسات پوشیدہ ھوں وہ ان پر قابو پا کر انہیں نمایاں کر دیتا ھے ، جہاں ھوس اقتدار خوابیدہ ھو وہ اسے جگا دیتا ھے ، لیکن پروپیگنڈے سے اچھائی یا برائی جو کچھ بھی کی جا سکتی ھے اس کی ایک حد ھے ۔ اس وقت تک کم از کم صورت یہی ھے ، لیکن جب جماعتی نفسیات مکمل ھو جائے تو حکومت جو کچھ اپنی رعایا سے منوانا چاھے شاید اس کے لیے کوئی حد باقی نہ رھے ۔

پروپیگنڈا چیزوں کی قدروں ، عام مسائل یا امور واقع کے متعلق ہو سکتا ہے اور ان تینوں حالتوں میں مختلف امور زیر نظر ہوتے ہیں ۔

تہائی قدریں ایسے امور ہیں جہاں دلیل سے کام چل سکے ۔ اگر کسی شخص کا یہ خیال ہو کہ مصیبت قابل قدر ہے ، اور یہ بہت ہی اچھا ہے کہ ہر انسان ہمیشہ سخت درد دنداں میں مبتلا رہے ، تو ہم اس سے اختلاف تو کر سکتے ہیں ، اور جب اسے دانتوں کے معالج کے پاس جاتا دیکھیں تو اس کا مذاق بھی اڑا سکتے ہیں ، لیکن ہم یہ نہیں ثابت کر سکتے کہ وہ غلطی پر ہے ، جیسا کہ ہم اس وقت کہہ سکتے اگر وہ کہتا کہ لوہا پانی سے ہلکا ہے ۔ اگر کوئی پیغمبر یہ نظریہ پیش کرے کہ مسرت انہی لوگوں کا حصہ ہے جن کے نام کا پہلا حصہ زیڈ کے حرف سے شروع ہوتا ہے تو اسے زکریا یا زکیہ یا زبیدہ جیسے نام والوں کے ایک لشکر کی پُر جوش امداد مل جائے ، لیکن آخرکار اسے جان اور جارج نام رکھنے والوں کے طاقت ور جم غفیر کے ہاتوں شکست ہوگی ۔ بہر حال یہ اس پیغمبر کے پیغام کی صرف واقعاتی تردید ہوگی جو منطقی طور پر اتنا ہی درست رہے گا جتنا کہ اس کی ضد ۔ اساسی قدروں کے متعلق لوگ متفق ہوں یا غیر متفق ، وہ توپوں سے لڑیں یا ووٹوں سے لیکن وہ منطقی طور پر حجت بازی نہیں کر سکتے ۔

عملی زندگی میں خالص منطقی بنیادوں پر اساسی قدروں کا سوال مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ لوگوں کو

فکر یہ ہوتی ہے کہ کرنا کیا چاہیے ؟ آیا فلاں کام کرنا چاہیے یا نہیں ؟ اس کا مدار دو باتوں پر ہوتا ہے : اول یہ کہ اس کے اثرات غالباً کیا ہوں گے ؟ دوم آیا یہ اثرات مجموعی طور پر اچھے ہوں گے ؟ یا زیادہ صحیح طور پر یوں کہنا چاہیے کہ آیا یہ اثرات کسی اور اپنے ہی عمل کے اثر سے جو ان حالات میں ممکن ہے ، مقابلتاً بہتر ہو سکتے ہیں ؟ ان دونوں مسائل میں سے پہلا سائنسی ہے نہ کہ اخلاق اور دوسرے تمام سائنسی سوالوں کی طرح عقلی دلائل سے ترمیم پذیر ہے ، لیکن جب دوسری صورت کے اس پہلو پر کہ کیا کرنا چاہیے ، نزاع پیدا ہوتی ہے تو اسے دلائل سے طے کرنے کا کوئی نظری امکان موجود نہیں ہوتا ۔

سیاسی جھگڑوں میں اختلاف کی عام طور پر دو صورتیں ہو سکتی ہیں ؛ اول رسمی دوم حقیقی ۔ ہر آدمی کو جب جبلت کے قدرتی تقاضوں پر چھوڑ دیا جائے تو اس کی رائے یہ ہوگی کہ اس کی اپنی مسرت ہی سب سے بڑی نیکی ہے اور اس کے خاندان کی باری اس کے بعد میں آتی ہے ۔ اس کی قوم ، اس کی جماعت اور اس کے ہم مذہب لوگوں کی مسرت اسی وقت تک مطلوب ہو سکتی ہے جب تک وہ اس کی اپنی مسرت سے متصادم نہ ہو ۔ اگر وہ ایک خود مختار بادشاہ ہے تو زندگی بھر اسی خیال پر قائم رہ سکتا ہے ، لیکن اگر نہیں (اور جو بہرحال ایک عام صورت ہے) تو وہ اپنی مرضی ساتھیوں کی امداد سے پوری کر سکتا ہے ؛ ساتھی اس صورت میں مل سکتے ہیں کہ وہ کم از کم

بظاہر ایسے مقصد کی جستجو میں لگ جائے جو اس میں اور ان میں مشترک ہو ۔ عام طور پر اس دکھاوے کی نوعیت کچھ حقیقی ہوگی اور کچھ نہیں ؛ جہاں تک کہ وہ حقیقی نہیں ہے ، اس کا انحصار ایک حد تک ہیجان کے پیدا کرنے پر ہوگا اور کسی حد تک مغالطہ دہ استدلال پر ۔ اس سلسلے میں مغالطہ دہ استدلال جو پارٹ ادا کرتا ہے ، وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا کہ عہد حاضر کے غیر منطقی لوگ خیال کرتے ہیں ؛ مثلاً جنگ عظیم کے خاتمے سے ۱۹۳۱ء کے موسم خزاں تک برطانوی صنعت کو برطانوی بنکاری کی بھینٹ چڑھایا گیا ، کیوں کہ برطانوی کارخانہ داروں کی ایک بہت بڑی جماعت کو وہ مغالطہ دہ دلائل اپنے ڈھب پر لے آئے جو برطانوی بنکاروں نے پیش کیے تھے ۔ ہر سیاسی جماعت درآں حالیکہ وہ حقیقی طور پر کسی جماعت کے مفاد کی نمائندگی کرتی ہو ، دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ دوسری جماعتوں کے مفاد کی نمائندہ بھی ہے ، لیکن اگر کوئی معقول دلیل نہ پیش کی جا سکے تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جذبات کو بھڑکا کر وہی نتائج حاصل کیے جائیں ۔ دونوں صورتوں میں اشیاء کی اساسی قدروں کے متعلق نزاع نہیں پیدا ہوتی کیونکہ کوئی سیاسی جماعت بھی یہ جرأت نہیں کر سکتی کہ کھلم کھلا اس جماعت کی خود غرضی کا اقرار کرے جس کے مفاد کی ترقی کے لیے اسے قائم کیا گیا ہے ۔ ہر سیاسی جماعت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس کا مدعا تمام قوم کی زیادہ سے زیادہ بھلائی ہے ، اگر اس دنیا میں

نہیں تو دوسری دنیا میں ، اس لیے اشیاء کی تہائی اخلاق قدروں کے سوال کو عقلی صورت میں نظر انداز کیا جا سکتا ہے ، اگرچہ جذباتی صورت میں ان کی سیاسی اہمیت باقی رہتی ہے ۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیاسی جھگڑوں کا کافی حصہ ایسا ہے جہاں سائنسی استدلال کی گنجائش ہے ۔ جب ایک گروہ کہتا ہے کہ اس کے مفاد دوسری جماعت کے مفاد کے عین مطابق ہیں تو اس کا یہ دعویٰ نظری طور پر ہمیشہ اور عملی طور پر بھی کبھی کبھی درست یا غلط ثابت کیا جا سکتا ہے ، شہنشاہیت پرست قومیں کہتی ہیں کہ پس ماندہ اقوام یعنی وہ قومیں جن کے پاس مضبوط مسلح افواج موجود نہیں ، ان کے سایۂ اقتدار میں زیادہ خوش ہیں ، بمقابلہ اس کے کہ وہ آزاد ہونے کی صورت میں ہوتیں ۔ جب تک عورتوں کو ووٹ دینے کا حق نہیں ملا تھا مرد کہتے تھے کہ عورتیں مردوں کی حکومت میں اس سے کہیں زیادہ خوش ہیں جتنی وہ مساوات کی دنیا میں ہوتیں ؟ کارخانہ دار کہتے ہیں کہ مزدور لوگ ان کی دانش مندانہ رہنمائی میں اس سے کہیں زیادہ خوش حال ہیں جتنے کہ وہ اس حالت میں ہوتے کہ کارخانے عوامی انتظام کے ماتحت ہوتے ۔ اس طرح کے دلائل سے عام طور پر مخاطب محکوم جماعت کے کچھ لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں ، لیکن چونکہ ایسی صورت میں یہ دلائل ذاتی مفاد سے ابھارے نہیں جاتے ، اس لیے ان کے مغالطہ دہ ہونے کی صورت میں یہ امر دلائل

سے واضح کیا جا سکتا ہے، اور اگر بر سراقتدار جماعت کو اپنی صداقت کے اذعان میں شبہ پیدا ہو جائے تو ان کا جذبۂ خود اعتمادی بھی کمزور ہو جائے گا۔ ۱۷۸۹ء میں بہت سے فرانسیسی اشراف اور اسی طرح ۱۹۱۷ء میں بہت سے روسی اشراف کو اس امر میں شبہ ہو گیا تھا کہ آیا ان کے طبقاتی حقوق حق بجانب ہیں۔ اگر یہ شک موجود نہ ہوتا تو انقلاب فرانس اور انقلاب روس کو کامیاب ہونے میں زیادہ دقتیں پیش آتیں۔

یہ تھا اشیاء کی قدروں کے سوال کا عقلی پہلو، لیکن عملی طور پر اخلاقی پروپیگنڈے میں جو ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں، وہ عقلی ہونے کے بجائے جذباتی ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ آخری تجزیے میں اقرار کے اندازوں کا انحصار جذبات پر ہے، یہ قدرتی ہے کہ اخلاقی پروپیگنڈا جذباتی ہو۔ اس کے باوجود اس امر میں امتیاز کرنا ہی پڑتا ہے کہ کس قسم کے جذبات ابھارے جاتے ہیں اور یہ کام کن ذرائع سے انجام پاتا ہے۔

جذباتی پروپیگنڈا بلاواسطہ یا بالواسطہ ہو سکتا ہے، "چچا ٹام کا کمرہ" (Uncle Tom's Cabin) بلاواسطہ پروپیگنڈا ہے اور اسی طرح "تم انگلستان کے ملاحو" (Ye Mariners of England) بلا واسطہ پروپیگنڈا ہے بلا واسطہ پروپیگنڈے میں مطلوب چیز کو ایسے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے بارے میں وہی جذبات بر انگیختہ ہو جائیں جو پروپیگنڈا کرنے والا چاہتا ہو۔ بالواسطہ پروپیگنڈا ایسے جذبات کو اکسانے پر مشتمل

ہوتا ہے جو بذات خود تو مقصد سے متعلق نہیں ہوتے البتہ یہ کام ایسے حالات میں کیا جاتا ہے جو مقصود کے ساتھ ایک رشتہ قائم کر دیتے ہیں ۔ کلیسا کی موسیقی اور ان تمام موسیقیوں میں جو کسی سماجی اجتماع میں استعمال کی جاتی ہے یہی مقصد ہوتا ہے ۔ انگریزوں کا اعلیٰ طبقہ اپنے پبلک سکولوں سے جو محبت محسوس کرتا ہے وہ ایک مرکب جذبہ ہے جس کی وجہ بڑی حد تک یہ حقیقت ہے کہ مدرسے کے ہجوم میں مختلف قسم کے زبردست سماجی جذبات دل کو گرماتے ہیں ۔ یہ جذبات اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ زندگی بھر باقی رہتے ہیں اور انہیں کافی سیاسی اہمیت حاصل ہے ۔ کلیسا کے بارے میں رومن کیتھولک فرقے کے جذبات کا تعلق ان احساسات سے ہے جو انھوں نے جوانی میں عشائے ربانی ، ایسٹر کے جمعے مذہبی رسم ایسٹر کی خوشی ، معطر دھونی سلگانے ، رات کی تاریکی اور پر اسرار فضا کے باعث محسوس کیے تھے ۔ جب اس قسم کے بچپن یا بلوغت کے زمانے کے زبردست احساسات کسی سیاسی جماعت کے متعلق ہو جاتے ہیں ، وہ اکثر ایک ایسا جذبہ پیدا کرتے یا کر سکتے ہیں جو تمام ذہنی اعتقادوں پر چھا جانے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ کیتھولک کلیسا نے اس پروپیگنڈے کو بہت اچھی طرح سمجھا ہے جس کی تکنیک کو اس نے دو ہزار برس میں مکمل کیا ہے ۔ قومی حکومتیں بھی یہی کچھ کرتی ہیں ، گو کسی قدر کم کامیابی کے ساتھ ، اور اس کی صورت فوجی نغمے اور فوجی نمائش وغیرہ کی ہوتی ہے ۔ میرے بچپن میں انگریز سپاہی

ابھی تک اپنے روایتی سرخ کوٹ ھی پہنتے تھے۔ فوجی دستوں کو مارچ کرتے دیکھ کر جو مسرت ہوا کرتی تھی وہ مجھے اب تک اچھی طرح یاد ھے۔ اس قسم کی مسرتوں کا اگر توڑ نہ کیا جائے تو ان سے عسکریت پر اعتماد پیدا ہونے کا احتمال ھے۔

جذباتی پروپیگنڈے میں بہت سے خطرے ھیں۔ اول یہ کہ اسے برے مقصد کے لیے بھی اسی طرح نہایت آسانی سے استعمال کیا جا سکتا ھے جتنا کہ اچھے مقصد کے لیے۔ چونکہ معقول طرز عمل میں عام طور پر جذبات پر کچھ قابو رکھنا پڑتا ھے، اس لیے ایسا پروپیگنڈا جس سے سادہ اور غیر مہذب جذبات کو ابھارا جا سکتا ہو، لازمی طور پر معقول طرز عمل کی راہ میں رکاوٹ ہوگا۔ جب لڑائی چھڑنے کو ہوتی ھے تو لوگ خوشیاں مناتے ھیں کہ اب وحشیانہ جذبات کھل کھیلیں گے، انھیں ایسی خوشی کا تجربہ ہوتا ھے جو اس مسرت سے پورے طور پر غیر مشابہ نہیں ہوتی جو ایک سنجیدہ مزاج آدمی کو محبت میں گرفتار ہونے پر محسوس ہوا کرتی ھے۔ مذھب اور وطنیت دونوں نہایت مبتذول ابتدائی جذبات کو بھلے معلوم ہوتے ھیں جو تہذیب کے لیے خطرناک ھیں۔ اگر انسانوں کو مل جل کر اکٹھے رہنا ھے تو انھیں ایک محتاط سماجی تعلیم کی ضرورت ہوگی اور ایک دوسرے سے جبلی مخالفت کو قابو میں رکھنا ہوگا۔ اگر غیر مہذب جذبات کی رسی ڈھیلی چھوڑ دی گئی تو اتنی بڑی انسانی آبادی کی بقا ناممکن ہوگی جو اس وقت مہذب ممالک میں پائی جاتی ھے، اس لیے مہذب لوگ

ان سادے ابتدائی احساسات کی طرف واپس جانے کے لیے ایک خاص قسم کی ۔ ۔ چینی یا ایک چبھن محسوس کرتے ہیں اور جذباتی پروپیگنڈا انھی جذبات کو ابھارتا ہے ۔ جنگ اور مذہب سیاسی لحاظ سے اس قسم کے عشق وطن کی اہم ترین صورتیں ہیں ۔

جذباتی پروپیگنڈے کا ایک اور خطرہ یہ ہے کہ عموماً یہ انسان کے کان دلائل کی طرف سے بند کر دیا کرتا ہے ؛ شعوری ذہن معقول ہو سکتا ہے ، لیکن شعوری سطح کے عین نیچے بچپن کے ناقابل تغیر عقائد موجود رہتے ہیں ۔ بہت سے لوگ پر سکون اوقات میں بین الاقوامی اور آزاد خیال ہوتے ہیں لیکن جب لڑائی یا موت کا خطرہ ہو تو وہ کٹر محب وطن یا مذہبی بن جاتے ہیں ۔ یہ صورت بلا شبہ کسی حد تک بچپن کے پروپیگنڈے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ۔ زیادہ تر یہ خوف کا قدرتی نتیجہ ہوتا ہے لیکن پروپیگنڈا اپنا پارٹ یوں ادا کرتا ہے کہ وہ اس خوف کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ اپنے آپ کو حب وطن یا عشق خدا کے بھیس میں زیادہ قابل احترام ظاہر کرے ۔

عام مسائل مثلاً مذہبی اعتقادیات کے بارے میں عام طور پر جذباتی ذرائع سے پروپیگنڈا کیا جاتا ہے ؛ مثلاً ایک کیتھولک کے لیے کیتھولک مذہب ہی کے متعلقہ جذبات عزیز ہوتے ہیں ۔ چنانچہ وہ چند ما بعد الطبیعیاتی حقائق پر ایمان لائے بغیر خوش نہیں رہ سکتا ۔ جہاں تک کسی مذہب کے عقائد کا تعلق ہے بلا شبہ نظری طور پر خالص عقلی دلائل سے ان کا مقابلہ ممکن ہے ، لیکن چند غیر معمولی

معقولیت پسند لوگوں کو چھوڑ کر دوسروں پر یہ چیز کامیاب نہ ہوگی۔ جب مردوں اور عورتوں کی ایک کافی تعداد اس مذہب کو چھوڑ دے جس میں وہ پل کر جوان ہوئے ہیں تو اکثر اوقات اس میں کوئی غیر شعوری اقتصادی محرک مصروف عمل ہوگا۔ اگر کلیساؤں کی جاگیروں اور روما کے خراج کا بیچ میں دخل نہ ہوتا تو تجدید مسیحیت کی تحریک کو کبھی وہ کامیابی نصیب نہ ہوتی جو اسے فی الواقع ہوئی۔ یورپ کے اشتراکی عام طور پر مسیحیت کے مخالف ہیں اور انھوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ عیسائیت دولت مندوں کی طرف دار ہے، اقتصادی دلائل پیش کیے ہیں۔ ایسا کم ہوا ہے کہ کسی مذہبی مسلک کا منطق سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا گیا ہو، غالباً اٹھارھویں صدی کی فرانسیسی عقلیت اہم ترین مثال ہے۔ بہر حال پسندیدہ یہی ہے کہ ان معاملات میں جن سے غیر استدلالی مذہب سروکار رکھتا ہے، یقین یا عدم یقین کا فیصلہ کرنے میں عقل کو موجودہ صورت کے مقابلے میں زیادہ دخل حاصل ہو۔ ایسا پروپیگنڈا جو بعض خاص مسائل میں اعتقاد یا عدم اعتقاد کے ساتھ بعض جذبات، بالخصوص جذبات تعریف یا نفرین کو وابستہ کر دے، وہ سائنسی روح کی راہ میں رکاوٹ ہے اور اسی لیے تہذیب کی راہ میں بھی۔

اگرچہ اس امر کا احتمال بعید ہے کہ حکومتیں بچوں کے باب میں بعض اہم پیچیدہ مسائل کے متعلق حزب مخالف کا پروپیگنڈا سننے کا طریق مصلحت اختیار کریں گی۔ مجھے

ذرا شبہ نہیں کہ اگر اسے رائج کر دیا جائے تو یہ بہترین تجویز ہوگی ۔ ایک استاد سے یہ کہنا کہ وہ اختلافی آرا کے اظہار سے بالکل اجتناب کرے ، گویا اس سے یہ مطالبہ کرنا ہے کہ وہ کند ذہن ہے اور اپنی آدھی شخصیت کو کچل دے ۔ یہ درست ہے کہ بعض لوگ ضرور ایسے ہیں جو کوئی جماعتی احساس نہیں رکھتے لیکن ایسے لوگ مشکل ہی سے جوشیلے استاد بن سکتے ہیں ۔ نہ یہ امر پسندیدہ ہے کہ تعلیم مصنوعی طور پران تمام مسائل سے دامن بچا کر رکھے جن پر معاصر واقعات کا انحصار ہے ۔ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے کہ وہ ایسے مسائل کے متعلق مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے بحث مباحثہ سننے کے بعد سوچ بچار کریں ۔ روسی سفیر اور مسٹر ونسٹن چرچل کو چاہیے کہ نظام اشتمالیت پر دوسرے پیر کے دن کو ریڈیو پر بحث کیا کریں ۔ مدرسے کے طلبہ کو یہ بحثیں سننے پر مجبور کیا جائے اور جب یہ بحثیں تین مہینے تک چل چکیں تو ہر مدرسے میں آزادانہ رائے شماری ہو ۔ منگل کو گاندھی اور وائسرائے ہند کے درمیان ہندوستان پر بحث ہو اور بدھ کو مارشل سٹالین اور کنٹربری کے اسقف اعظم کے درمیان عیسائیت پر ۔ یہ جمہوریت میں حصہ لینے کے لیے حقیقی تیاری ہوگی اور اس سے طلبہ جانب دارانہ بیانات سے استنباط صداقت کا مشکل فن سیکھ جائیں گے ۔ پروپیگنڈے میں بہ ذات خود کوئی برائی نہیں ، برائی در اصل یک طرفہ پروپیگنڈے میں ہے ۔ پروپیگنڈے پر معترض ہونا اور وہ صورت جسے ''مقاومت بائع'' کہتے ہیں ، ایک حد درجہ

پسندیدہ شے ہے اور اسے پروپیگنڈے سے دور رہ کر حاصل کرنا ایسا ہی ہے جیسے خسرے سے دور رہ کر خسرے سے سلامتی حاصل کرنا۔ یہ شے پروپیگنڈے کا تجربہ کرنے اور یہ معلوم کر لینے سے حاصل ہوا کرتی ہے کہ پروپیگنڈا اکثر گمراہ کن ہوتا ہے، اس مقصد کے لیے کوئی تجویز اتنی موزوں نہیں ہو سکتی جتنی یہ کہ ہر مدرسے میں مخالف نقطۂ نگاہ سے پروپیگنڈا کرنے والے لوگ موجود ہوں، نشریات اس غرض کے لیے ذریعہ بن سکتی ہیں۔

میرے نزدیک یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ کم از کم سماجی تعاون کے لیے غیر جوابی یک طرفہ پروپیگنڈے کی ایک خاص مقدار ضروری ہے۔ ایسے موقعے پیدا ہو سکتے ہیں جب قانون کی خلاف ورزی کرنا ایک فرض بن جائے لیکن ایسے موقعے کم ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر قانون کا احترام ایک قابل تعریف شے ہے۔ اگر جنگوں سے بچنے کی کبھی کوئی صورت ہو سکتی ہے تو یہ کہ جھگڑے چکانے کے لیے ایک بین الاقوامی نظام ہو اور اس جماعت کا احترام سکھانا ضروری ہوگا۔ ایک امن دوست آدمی کہہ سکتا ہے کہ یہ ایسا پروپیگنڈا نہیں جو نقصان دہ ہے بلکہ مخالف قسم کے پروپیگنڈے کا وجود ضرر رساں ہے۔ اگر ہر قوم اپنے جذبۂ قومیت کی تعلیم دینے کے بجائے اضلاع متحدہ کا احترام سکھائے تو اقوام میں تصادم کا کوئی موقع ہی پیدا نہیں ہوگا اور اگر تمام دنیا میں اقتصادیات کی تعلیم اشتمالی ہو، یا سرمایہ دارانہ ہو تو سوویٹ حکومت اور مغربی طاقتوں کے درمیان نزاع جلد

ختم ہو جائے گی ۔ ایک امن دوست اس طرح استدلال کر سکتا ہے لیکن ایسی تجویز پر بہت سے اعتراض ہو سکتے ہیں ۔ جس دنیا میں ایک ہی مشکوک مسئلے کے بارے میں صرف ایک ہی نقطۂ خیال سکھایا جا سکے وہاں ترقی کا کوئی امکان نہیں ، اور جس دنیا میں کبھی کسی موضوع پر بحث ہی نہ ہو وہاں ناقدانہ رائے کی تربیت مطلق نہ ہوگی ۔ پس ترقی کے لیے اور موافق و مخالف پہلوؤں کو تولنے کی تربیت دینے کے لیے ضروری ہے کہ پروپیگنڈا حتی الامکان مختلف النوع ہو ۔ یہ چیز ہر قسم کے سیاسی احتساب پر اعتراض کا ایک حصہ ہے ۔

تعلیم کا سب سے اہم حصہ اور وہ حصہ جس سے زبردست غفلت برتی جاتی ہے ، وہ ہے جو غیر مکتفی مواد کے باوجود درست نتائج تک پہنچنے کا طریقہ سکھاتا ہے ۔ ایک منطقی کی حیثیت سے میں خوب جانتا ہوں کہ خالص منطق کی رو سے میرا یہ کہنا محض لغویت ہے ، لیکن اس کے باوجود عملی زندگی میں انسان کی کامیابی کا انحصار اس بظاہر غیر ممکن کرتب کے سر انجام دینے ہی پر ہے ۔ کامیاب جرنیل وہی ہے جو صحیح طور پر اندازہ لگا لے کہ اس کا غنیم کیا کرے گا ، کامیاب منتظم وہی ہے جو ایک مختصر ملاقات کے بعد بہترین ماتحتوں کا انتخاب کر سکے ، بلکہ ایک کامیاب انسان بھی ایسا تخمینہ لگاتا ہے جو بعد میں درست ثابت ہوتا ہے ۔ سیاسیات میں مشکل ہی سے اتنا کافی مواد ہاتھ لگ سکتا ہے کہ ایک معقول آدمی کسی مدلل نتیجے پر پہنچ سکے ، لیکن وہ مواد ایسا ضرور ہوتا

ہے کہ کوئی معقول اور ہوشیار آدمی دانش مندانہ نتائج تک پہنچ سکے۔ اس کام کے لیے سائنسی طور پر تعصب سے خالی ہونا اور قیاس کی استعداد رکھنا ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ کچھ اور بھی چاہیے۔ (یعنی) وہ وصف جسے مبہم طور پر ''قوت فیصلہ'' کہتے ہیں، یہ ایسا وصف ہے کہ کسی خاص شعبے میں مناسب مواد کے تجربے سے اس میں کافی ترقی ہو سکتی ہے۔ نوجوانوں کو تعلیم کے کسی مرحلے پر سیاسی آرا قائم کرنے کا ڈھب سکھانا ضروری ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ وہ ان فصیح تقریروں کو سنیں جن کے متعلق وہ پہلے سے جانتے ہوں کہ وہ گمراہ کن نہیں۔ وہ گزشتہ واقعات کے متعلق جانب دارانہ جذبات پڑھیں اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کریں کہ اصلی واقعات کیا تھے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کچھ پروپیگنڈے کا توڑ ہے اور یہی وہ تکنیک ہے جس سے انسان پروپیگنڈے سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

مجھے علم ہے کہ جو کچھ میں کہتا آیا ہوں اس میں میں نے بن کہے ایک ایسے مختلف مسئلے میں جانب دارانہ رویہ اختیار کیا ہے جس کا مسئلۂ زیر بحث سے بہت کچھ تعلق ہے۔ میں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ خیالات و آرا مفید اور مضر ہونے کے علاوہ درست اور نا درست بھی ہو سکتے ہیں۔ میں نے یہ بھی فرض کر لیا ہے کہ کم از کم جہاں تک امر واقعہ کا تعلق ہے، کسی رائے کی درستی کو معلوم کرنا عام طور پر اس کی افادیت معلوم کرنے سے زیادہ سہل ہے اور بالآخر میں نے یہ بھی فرض

کر لیا ہے کہ ایک عام اصول کے طور پر درست بات کا مان لینا نادرست بات کے مان لینے سے زیادہ مفید ہے۔ ان تمام مفروضوں پر اعتراض کیا جا سکتا ہے؛ چنانچہ نظریۂ عملیت کے پیرو اور اشتمالی دونوں ان پر اعتراض کرتے ہیں؛ اب ہم ان مفروضوں پر زیادہ توجہ سے غور کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سیزر مارچ کی پندرہ تاریخ کو قتل کیا گیا۔ میں نے اس کی شہادت پر زیادہ احتیاط سے غور نہیں کیا، لیکن میں نے اس واقعے کو مختلف کتابوں میں جو قابل اعتبار معلوم ہوتی ہیں، پڑھا ہے، اس لیے میں اسے درست مانتا ہوں۔ جوانی میں اس واقعے کا صحیح ماننا مفید ہے کیوں کہ یہ امتحان میں کامیابی کا ذریعہ ہو سکتا ہے، لیکن جب ایک دفعہ امتحان کا وقت گزر جائے تو اس واقعے کو سچا ماننے کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ بہر خال اب ہم دوسرے مفروضے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس واقعے کی صحت کا علم کہ "سیزر مارچ کی پندرہ تاریخ کو قتل کیا گیا تھا" اس کی افادیت کے علم کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے جو کہ ان لوگوں کے سوا جن کو امتحان دینا ہو حد درجہ مشتبہ ہے۔ یہ کہہ کر میں بظاہر اپنے تیسرے مفروضے کی تردید کر رہا ہوں، یعنی "بہ حیثیت عام اصول کے سچی بات کو مان لینا بہ نسبت جھوٹی بات ماننے کے زیادہ مفید ہے" یہ امر صرف اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب پہلی یا دوسری مشق میں افادیت موجود ہو۔ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن کا ماننا یا نہ ماننا دونوں بے سود

ہوتے ہیں؟ مثلاً خیال کیجیے کہ پہاڑے اور آگے بڑھا کر بڑے سے بڑے ہندسوں تک پھیلا دیے گئے ہیں۔ اب یہ لامحدود مسائل پر مشتمل ہوں گے جن سے عملی طور پر صرف محدود تعداد ہی مفید ثابت ہو سکتی ہے، لیکن جب کبھی کسی وجہ سے ان میں کسی ایک مسئلے کی ضرورت ہوگی یہ حد درجہ غیر اغلب ہے کہ درست کے بجائے نا درست زیادہ مفید ثابت ہو، لیکن یہ چیز ناممکن نہیں ممکن ہے۔ تم پہلے ایک غلطی کر چکے ہو اور نئی غلطی سے اس کی تلافی ہو جائے گی، لیکن یہ امکان اتنا بعید الوقوع ہے کہ ایک سیاست دان کو جو بجا طور پر یہ چاہتا ہے کہ بچے درست سوال حل کریں، اس سے کچھ غرض نہیں۔

ایک اشتمالی حساب میں ہم سے اتفاق کر سکتا ہے لیکن مختلف چند مسائل میں وہ یہ کہے گا کہ ایک نقطۂ نگاہ متوسط طبقے سے مخصوص ہے اور ایک مزدوروں سے اور مزدور فوج کے اچھے سپاہی کو مزدور کے زاویۂ نگاہ کی حمایت کرنی چاہیے۔ مثلاً حیات ابدی کا سوال لو، ایک اشتمالی یہ کہے گا کہ اس مسئلے کو حل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم روح و جسم کے تعلق یا نفسیاتی تحقیقات سے جمع شدہ شہادتوں پر غور کریں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم فیصلے کو اس بنا پر ملتوی کر دیں کہ شہادتیں فیصلہ صادر کرنے کے لیے نا کافی ہیں لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اگلی زندگی کے وعدۂ بہشت کو اس غرض سے استعمال کیا جاتا ہے کہ مزدور اس دنیا میں اپنی قسمت پر شاکر رہیں اور اس سے کمتر اجرت پر مطمئن ہو جائیں،

جتنی وہ بہ صورت دیگر مانگتے ۔ اس طرح مزدور کو بتایا جاتا ہے کہ حیات ابدی کا نظریہ سرمایہ داری کا ہتھیار ہے، اس کا انکار اشتمالیت کے ہتھیاروں سے ایک ہتھیار شمار کیا جاتا ہے ۔ درستی یا نادرستی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، اس کی مثال وہی ہے جیسے کوئی یہ پوچھے ''آیا گولی سچی ہے یا کہ جھوٹی ؟'' حالانکہ گولی کے متعلق اہم بات یہ ہے کہ وہ کس فوج کی خدمت بجا لاتی ہے ؛ اسی طرح ایک خیال کے بارے میں بھی جو چیز اہم ہے وہ یہی ہے ۔

بلا شبہ یہ نظریہ سائنسی انداز فکر کی نفی ہے جو یہ ہے کہ ایک بڑے حصے میں حقیقت کے لگ بھگ پہنچ جانا ممکن ہے مگر جہاں ایسا نہ ہو سکے وہاں فیصلے کو ملتوی کر دینا ہی معقول طرز عمل ہے ۔ مزید برآں ایک اشتمالی مستقل طور پر اپنی مشکوک حیثیت پر قائم نہیں رہتا ۔ کلامی مادیت کو حقیقی طور پر درست مانا جاتا ہے، یہ نہیں کہ اس پر اعتقاد رکھنا مزدور کے لیے ''قرین مصلحت'' ہے، نیز اس مسئلے کو بھی حقیقتاً سچ سمجھا جاتا ہے کہ فلاں چیز کا ماننا ایک مزدور کے لیے عین مصلحت ہے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسے پروپیگنڈے کی اساس نہ قرار دیا جاتا ؛ چنانچہ اشتمالیوں کا نظریۂ عملیت صرف نیم درانہ ہے اور اظہار بے صبری سے کچھ زیادہ نہیں ۔

میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ صداقتیں موجود ہیں، بعض اوقات ان کے متعلق تخمینی علم ہو جاتا ہے اور یہ اکثر مفید ہوتا ہے اور باطل پر یقین رکھنا بہت شاذ فائدہ

دیتا ہے؟ مزید بر آں میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تعلیم کا ایک مقصد یہ ہونا چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو نوجوانوں کو درست نتائج تک پہنچنے کی تربیت دے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو جماعتی جذبے کی تلخی اور تباہ کن آویزش کے خطرات بڑھتے جائیں گے۔ عقلی پہلو سے یہ چیز سائنسی ترقی کو نہایت بری طرح روک دے گی۔ جب سیاست دانوں کے دل میں تعلیم کو سیاسی پروپیگنڈے کا ایک شعبہ خیال کرنے کی خواہش پیدا ہو تو بہتر ہوگا کہ وہ ان تمام امور کو پیش نظر رکھیں۔

باب شانزدهم

انفرادیت اور شہریت میں مصالحت

پہلے باب میں ہم نے ایک سوال تجویز کیا تھا کہ آیا مکمل انفرادی نشو و نما کم از کم ضروری سماجی ہم آہنگی کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے؟ اس سوال کی وجہ سے ہم نے ان مختلف طریقوں پر غور کیا جن سے سیاسیات و اقتصادیات تعلیم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے اکثر متعلقہ لڑکے لڑکیوں کے لیے مضر ہیں، لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ افراد پر سیاسیات اور معاشیات کا اثر ہمیشہ مضر ہی ہو؟ یا کیا یہ ہمارے زمانے ہی کی ایک ہنگامی بد بختی ہے اور موخرالذکر صورت میں اس امر کی کیا امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں انفرادیت اور شہریت میں بہتر ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی؟

سیاسیات کی وجہ سے تعلیم کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ عام طور پر دو اسباب سے پیدا ہوتا ہے۔ اول یہ کہ کسی جانب دار گروہ کے مفاد کو انسانیت کے مفاد پر مقدم سمجھ لیا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ انبوہ اور دفتری

حکومت دونوں میں ہم آہنگی کی بہت زبردست خواہش پائی جاتی ہے ۔ ان دونوں خرابیوں میں سے اس وقت اول الذکر زیادہ بڑی ہے ، لیکن اگر پہلی پر قابو پا لیا جائے تو ممکن ہے دوسری بہت زیادہ خطرناک بن جائے۔

تعلیم میں یہ دستور رہا ہے کہ اپنی ریاست ، اپنے مذہب ، صنف قوی اور دولت مندوں کی رعایت کی جائے۔ جن ملکوں میں کئی مذاہب پہلو بہ پہلو موجود ہیں وہاں حکومت اپنے مدارس میں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ رعایت کرنے کے قابل نہیں ہوتی ، لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مختلف فرقوں نے اپنے مدرسے جاری کر لیے ہیں یا جیسا کہ نیویارک اور بوسٹن کے شہروں میں ہوا ہے ، پبلک مدرسوں میں کیتھولک مفاد کی خاطر تاریخ کو مسخ کر کے پڑھایا جاتا ہے۔ صنف قوی کی حمایت پہلے کی طرح اب نہیں کی جا سکتی ، لیکن روس کے سوا باقی تمام ممالک میں تعلیم اس طرح دی جاتی ہے جس سے دولت مند طبقے کے مفاد کی تقویت ہوتی ہے اور بلا شبہ یہ ہر جگہ بلا شرکت غیرے صرف اپنی ریاست سے وفاداری سکھاتی ہے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم مختلف مذہبوں ، جماعتوں اور قوموں کی کشمکش اقتدار کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ طالب علم بہ ذات خود مقصد نہیں رہا بلکہ اس کی حیثیت ایک رنگروٹ کی ہے۔ تعلیمی نظام کو اس کی بہبود سے کچھ سروکار نہیں بلکہ پوشیدہ سیاسی مقاصد ہی سے واسطہ ہے۔ یہ تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ

ریاست کبھی طالب علم کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دے گی ، اس لیے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا کسی ایسی حکومت کا امکان بھی ہے جس کا مفاد کم از کم تعلیمی معاملات میں طالب علم کے مفاد سے ملتا جلتا ہو ۔

ظاہر ہے کہ اس مقصد کی پہلی شرط بڑی لڑائیوں کا انسداد ہے ۔ اگر ایک بین الاقوامی حکومت کے قیام سے یہ مقصد حاصل کیا جا سکے تو جنگ جویانہ قوم پرستی کی تعلیم دینا خود بخود بے سود ہو جائے گا اور جلد ہی اس حد تک کم ہو جائے گا کہ اس میں ضرر نہ رہے گا ۔ اس کے بعد نہ تو فوجی افسروں کی تربیت گاہوں (او ۔ ٹی ۔ سی) کی ضرورت باقی رہے گی ، نہ لازمی فوجی تربیت کی اور نہ غلط تاریخ پڑھانے کی ۔ اخلاق تربیت قتل انسان کو نیکوکارانہ زندگی کی ایسی معراج نہیں سمجھے گی جس پر تمام راہیں آ کر ختم ہو جاتی ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی مضبوط بین الاقوامی حکومت کا قیام جو ضدی اقوام کے خلاف جھگڑوں کے فیصلے نافذ کرنے کی اہلیت رکھتی ہو ، نہ صرف تعلیمی بلکہ باقی ہر زاویۂ نگاہ سے بھی نہایت اہم اصلاح ہے ۔

لیکن ایسی حکومت کے قیام کی راہ میں کٹھن رکاوٹیں ہیں ، اس سے کہیں زیادہ کٹھن جتنا اکثر امن پسند لوگوں کا خیال ہے ، مثلاً اس امر ہی کو لیجیے جو سرمایہ داری اور اشتمالیت کے درمیان ما بہ النزاع ہے ۔ یہ حد درجہ غیر اغلب ہے کہ یہ تنقیح طلب امر صلح صفائی سے طے ہو سکے گا ۔ دونوں طرف کے لوگ یہ خیال

کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ اس قدر بنیادی ہے کہ اس کی خاطر جنگ کرنا بجا ہے اور کسی ایسے بین الاقوامی نظام کا تصور مشکل ہے جو اتنا طاقت ور ہو کہ اس سوال کو جنگ کی شکل اختیار کرنے سے روک سکے ۔ فرض کیجیے کہ جرمنی میں قوم پرستی اور اشتمالیت کے درمیان خانہ جنگی ہوتی ہے ، کیا فرانس اور روس خاموشی سے دیکھتے رہیں گے ؟ اگر فرانس اور روس اس میں کود پڑے تو کیا برطانیۂ عظمیٰ غیر جانب دار رہے گی ؟ کیا ریاست ہائے متحدہ امریکہ یہ خطرہ مول لے گا کہ تمام یورپ میں اشتمالیت پھیل جائے ؟ کیا ہندوستان اور چین اس موقع سے فائدہ نہیں آٹھائیں گے ؟ جب تک سرمایہ داری اور اشتراکیت کا جھگڑا ایک طرح یا دوسری طرح نپٹ نہیں جاتا ، خواہ کوئی بین الاقوامی نظام بھی قائم کیا جائے ، امن عالم محفوظ نہیں ہو سکتا اور یہ خیال کرنا مشکل ہے کہ کم از کم سارے یورپ میں اشتمالیت کی فتح کے بغیر اس جھگڑے کا فیصلہ کیوں کر ہو سکتا ہے ؟ اب سرمایہ داری تو اطمینان پیدا کرنے سے رہی ، شاید زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ روس میں زندگی کی راحت کا معیار باقی ملکوں سے اونچا ہو جائے گا ۔ ایسی صورت حال کا اثر پروپیگنڈے کے نقطۂ نگاہ سے نا قابل انسداد ہوگا ، اس لیے یہ غیر اغلب معلوم نہیں ہوتا کہ امن عالم کا قریب ترین راستہ روسی پروپیگنڈے کی وساطت سے ہے ۔ اگر یہ درست ہے تو روسی حکومت کے ان قدرے بھونڈے طریقوں پر معترض ہونا کوتاہ اندیشی ہے جو وہ اپنے لڑکے لڑکیوں

کو اشتمالیت کی تعلیم دینے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ میں اس پر قطعی حیثیت سے زور نہیں دیتا ، میں اسے بطور ایک ایسے مفروضے کے پیش کر رہا ہوں جو کسی طرح غیر اغلب نہیں۔ یہ بلا شبہ ظاہر ہے کہ اس وقت تک تسلی بخش امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک جرمنی کو اس بات کی سزا ملنی بند نہیں ہو جاتی کہ اس نے جنگ میں شکست کھائی ، اور یہ اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک فرانس تمام یورپ پر بالا دست رہنا چھوڑ نہیں دیتا ، اور شاید فرانس جنگ کے سوا اس بالا دستی کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو سکے گا۔

یہ امر بھی مشتبہ ہے کہ آیا انگلستان کے تسلط سے ہندوستان ، اور جاپان کے تسلط سے چین کی آزادی ایک بڑی جنگ کے بغیر ممکن ہے[1]۔

قبل اس کے کہ ایک بین الاقوامی ادارے کے قیام سے امن عالم کی بقا کی معقول امید بندھ سکے، یہ تمام بڑے بڑے سوالات حل کرنا پڑیں گے۔ شاید یہ تمام مسائل آئندہ بیس سال میں اشتمالیت کی کامیابی سے حل ہو جائیں لیکن میں اتنا رجائی نہیں ہوں کہ اس کی امید رکھوں۔

خطرۂ جنگ کے خاتمے کے دوسرے درجے پر فرد اور شہری میں مصالحت کی ایک شرط تو یہ ہوئی کہ خطرۂ جنگ نہ رہے ، اس سے دوسرے درجے پر جو اہم

۱۔ یہ کتاب ہندوستان اور چین کی آزادی سے پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ (مترجم)

شرط ہے وہ اوہام پرستی کا خاتمہ ہے۔ اس مقصد کے لیے میں ہر اس اعتقاد کو ضعیف الاعتقادی کہوں گا جس کی اساس خالص روایاتی یا جذباتی ہو۔ جب لوگ ایسے عقائد کی حفاظت اہم سمجھیں تو وہ ایسے نظام ہائے تعلیم قائم کریں گے جو اسلاف کی دانش مندی کے احترام پر مبنی ہوں گے اور یہ عادت پیدا کریں گے۔ کہ مسائل کا فیصلہ عقل کی بجائے دوسری بنیادوں پر کیا جائے۔ ارباب اختیار تقریباً ناگزیر طور پر یہ پسند کرتے ہیں کہ رعایا معقول ہونے کے بجائے جذباتی ہو، کیونکہ اس سے ان لوگوں کو جو ظالم سماجی نظام کا شکار ہوں، آسانی سے اپنی قسمت پر راضی رکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح ضعیف الاعتقادی ظلم کی قدرتی معاون بن جاتی ہے اور صرف اسی جگہ حکومت کی تعلیم لوگوں میں معقول زاویۂ نگاہ کو ترقی دے سکتی ہے جہاں اقتصادی اور سیاسی ادارے انصاف پر مبنی ہوں۔

بے شک اس بات کے متعلق کچھ یقین نہیں کہ اگر ایک لمبی کشمکش کے اثر سے ایک منصفانہ اقتصادی نظام قائم ہو گیا تو اس میں اول اول ضعیف الاعتقادی کو عمل دخل نہیں ہوگا۔ لڑائی کے زمانے میں جوش پیدا کرنے کے لیے جھوٹے عقیدوں سے کام لیا جاتا ہے اور نصب العین کی اہمیت کو شکوک سے محفوظ رکھنے کے لیے کڑا ذہنی ضبط مفید ثابت ہوتا ہے۔ روسی اشتمالیت میں پہلے ہی مذہبی عقائد کا مجموعہ، "انبیا اور اولیا" کا سلسلہ اور اس کی "مقدس تاریخ" موجود ہے۔

اگر ایک صدی کی کشمکش کے بعد رومی عقائد نے دنیا کو ہم‌خیال بنا لیا تو اس اثنا میں یہ اپنے لیے کافی روایات مقدسہ اور شدید عقائدی سختی پیدا کرلیں گے۔ وہ زمانہ آنے پر جو شخص یہ کہنے کی جرأت کرے گا کہ مارکس اور لینن دنیا کی عظیم ترین شخصیت نہیں تھیں، احتمال ہے کہ اسے سخت تکالیف دی جائیں گی۔ یہ ممکن ہے، اگرچہ میں اسے اغلب نہیں سمجھتا، کہ اشتمالی جماعت تقریباً وہی حیثیت حاصل کر لے جو از منۂ مظلمہ میں کلیسا کو حاصل تھی، یہ بھی ممکن ہے کہ اشتمالیت کی فتح سے پہلے کی جنگیں دنیا کے تمام صنعتی ساز و سامان کو تباہ کر دیں اور تمام ماہرین سائنس اور کامل‌الفن لوگوں کی موت کا باعث ہوں۔ اس صورت میں جب لوگ ''مذہبی کتب'' میں یہ لکھا ہوا پائیں گے کہ لینن بجلی کے عام ہو جانے سے نجات کی توقع رکھتا تھا تو لوگوں کو تعجب ہوگا کہ اس لفظ کا کیا مفہوم ہے اور ممکن ہے وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ اس لفظ سے کارل مارکس کے ساتھ روحانی اتحاد مقصود ہے، اس لیے یہ چیز ناقابل تصور نہیں کہ ایک ایسی عالم گیر حکومت قائم ہو جائے جس کا اقتصادی نظام تو منصفانہ ہو لیکن پھر بھی وہاں اوہام پرستی کا دور دورہ ہو، لیکن جب تک خوفناک طور پر تباہ کن جنگوں کا مفروضہ تسلیم نہ کر لیا جائے ایسی صورت کا واقع ہونا مشکل ہے، دوسرے ہر مفروضے کی بنا پر توقع یہ ہے کہ ضعیف‌الاعتقادی کے وہ عناصر جو اس وقت سوویٹ روس

کے ساتھ وابستہ ہیں، کامیابی کی وجہ سے جنگی ذہنیت ختم ہو جانے پر خود بخود نابود ہو جائیں گے؛ انجام کار اشتمالیت کا عقیدہ بھی چنداں اہم نہیں رہے گا کیوں کہ کوئی اور نظام عملی سیاست کی حد نظر میں باقی نہیں رہے گا۔

اب میں ایک دوسرے خطرے کی طرف توجہ کرتا ہوں اور وہ ہے "یکسانی کی حد سے زیادہ خواہش" جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں یہ خواہش دفتری حکومت اور انبوہ دونوں میں پائی جاتی ہے، بالخصوص دس سے پندرہ سال کی عمر تک کے بچے فطرتاً دوسرے بچوں میں ہر انوکھی چیز کے خلاف ہوتے ہیں۔ اگر ارباب اختیار محسوس کریں کہ یہ اہمیت نا پسندیدہ ہے تو وہ کئی طریقوں سے اس کی روک تھام کر سکتے ہیں اور جیسا کہ ایک گزشتہ باب میں تجویز کیا جا چکا ہے، وہ زیادہ ہوشیار بچوں کو علیحدہ مدارس میں رکھ سکتے ہیں۔ انوکھے پن کو برداشت نہ کرنے کا جذبہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، سب سے احمق بچوں میں شدید شکل اختیار کرتا ہے، وہ ہوشیار لڑکوں کے مخصوص ذوق کو انہیں ستانے کی جائز وجہ قرار دیتے ہیں۔ جب ارباب اختیار بھی احمق ہوں (جو ممکن الوقوع ہے) تو ان کا میلان احمق لڑکوں کی پاس داری کی طرف ہوگا اور وہ ذہین لڑکوں کے ساتھ بدسلوکی سے اغماض نہ کریں گے، جس صورت میں ایک ایسا معاشرہ پیدا ہوگا جس میں تمام اہم آسامیوں پر وہ لوگ قابض ہوں گے جو اپنی حماقت

کے طفیل انبوہ کو خوش کرنے کے قابل ہوں گے۔ ایسے معاشرے میں سیاست دان بد دیانت ہوں گے ، استاد جاہل ، پولیس کے سپاہی ایسے جو مجرم کو نہ پکڑ سکیں اور جج ایسے جو بے گناہوں کو مجرم قرار دیں۔ ایسا معاشرہ خواہ ایسے ملک ہی میں کیوں نہ بستا ہو جو قدرتی دولت سے مالا مال ہو ، وہ انجام کار اہم اسامیوں کے لیے قابل آدمیوں کا انتخاب نہ کر سکنے کی وجہ سے غریب ہو جائے گا۔ ایسا معاشرہ خواہ آزادی کی رٹ لگائے اور اس کے احترام میں بت بھی نصب کرے، ایک اذیت رساں معاشرہ ہوگا جو انھی لوگوں کو عذاب دے گا جن کے خیالات و افکار شاید اسے تباہی سے بچا سکتے؛ یہ سب کچھ انبوہ کے حد سے بڑھے ہوئے دباؤ کی وجہ سے ہوگا۔ اول مدرسے میں اور بعد ازاں عام دنیا میں جہاں اس قسم کا حد سے بڑھا ہوا دباؤ موجود ہو، وہاں تعلیم کے ناظموں کو عموماً یہ خبر نہیں ہوتی کہ یہ بھی کوئی برائی ہے ، بلکہ سچ یہ ہے کہ غالباً وہ اس کا خیر مقدم ایک ایسے عامل کے طور پر کریں گے جو اچھا کردار پیدا کرنے والا ہے، اس لیے اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ وہ کون سے حالات ہیں جو اساتذہ اور حکام تعلیم کو اس غلطی میں ڈال دیتے ہیں اور آیا کوئی نظام انہیں ایسا کرنے سے روک بھی سکتا ہے۔

پیشۂ تعلیم میں بہت ہی مختلف قسم کے لوگ ہیں۔ کچھ تو ایسے ہیں جن میں کسی خاص مضمون کا

ذوق پایا جاتا ہے ، وہ اسے پڑھانے میں لطف محسوس کرتے ہیں اور اپنا ذوق شاگردوں کے دلوں میں جاگزیں کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اختیارات اور سہل الحصول برتری کی حیثیت سے حظ اٹھاتے ہیں جو حکومت کرانا پسند کرتے ہیں لیکن بالغوں پر حکومت کرنے کا کافی سلیقہ نہیں رکھتے۔ بعض نظام اول الذکر کے حق میں مفید ہیں اور بعض آخرالذکر کے حق میں۔ جدید معیار قابلیت کا روز افزوں رجحان یہ ہے کہ پڑھانے والے کے بجائے حکومت کرنے والے کی پیٹھ ٹھونکی جائے۔ مجھے انکار نہیں کہ حاکم قسم کے لوگوں کے بھی فائدے ہیں ، میری ایک دفعہ ایک خاتون کے ساتھ جان پہچان تھی جو ریاست ٹیکساس کے پبلک سکول میں پڑھاتی تھی ، وہ سکول میں ہمیشہ ریوالور سے مسلح ہو کر آتی تھی ، لیکن دور افتادہ اور کم آباد علاقوں کے سوا ان لڑکے لڑکیوں کو جو غیر معمولی طور پر سرکش ہیں ، علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو باقی رہ جائیں گے اپنے سرغنوں کی غیر موجودگی میں کمتر سخت طریقوں سے اصلاح پذیر ہو سکیں گے۔ جو استاد اپنے مضمون کی محبت اور بچوں کی شفقت سے سرشار ہے ، وہ اکثر حالات میں اس آدمی کے مقابلے میں کہیں زیادہ کامیابی کے ساتھ علم و تہذیب سکھا سکتا ہے جو نظم ، طریقے اور کارگزاری کا تو دل دادہ ہو لیکن جو علم نہ رکھتا ہو اور اپنے بچوں سے نفرت ہو۔ بد قسمتی سے ہر بڑے مدرسے میں روزمرہ کا اتنا انتظامی

کام ہوتا ہے جسے عام طور پر بدترین اساتذہ بہترین طریقے پر سر انجام دیتے ہیں اور چونکہ افسران بالا صرف انتظامی کام کو دیکھتے ہیں اور عام طور پر تعلیمی کام کو نہیں دیکھتے اس لیے رجحان یہ ہے کہ نیک نامی کی تقسیم بالکل غلط ہوتی ہے ؛ علاوہ ازیں ہر بڑے انتظامی کارخانے میں قدرتی طور پر ذمہ دار افسر نظم و نسق کو بہت ہی قابل احترام اور مشکل قسم کا کام جاننے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھانے والوں کے مقابلے میں بلند منصب اور زیادہ تنخواہیں انہیں دی جاتی ہیں جو مدارس کا انتظامی کام سر انجام دیتے ہیں۔ ان تمام باتوں کا رجحان غلط قسم کے استاد پیدا کرنے کی طرف ہے۔ یہ حاکم قسم کے لوگ ہی ہیں جو یکسانی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور دوسرے قسم کے لوگ قابلیت میں مسرت محسوس کرتے ہیں (جو بہ ذات خود ایک قسم کا انوکھا پن ہے) اور قابلیت کی خاطر خوشی سے بعض اور بوالعجبیوں کو بھی برداشت کر لیتے ہیں، اس لیے یکسانی کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ان اساتذہ کی ہمت افزائی کرنا از بس ضروری ہے جو حکومت کرنے کے بجائے پڑھانے کے شائق ہوں۔

اب ہم ایک مسئلے کے ایک ایسے پہلو پر پہنچ گئے ہیں جس کے متعلق احتمال ہے کہ دنیا جس قدر زیادہ منظم ہوتی جائے گی، وہ پہلو زیادہ سے زیادہ سنجیدہ شکل اختیار کرتا جائے گا۔ جو آدمی کسی بڑے نظام میں کسی با اقتدار منصب پر فائز ہو اس میں ایک خاص

قسم کی قابلیت چاہیے ، یعنی وہ قابلیت جسے انتظامی یا عاملانہ قابلیت کہتے ہیں ۔ اس سے بہت کم فرق پڑتا ہے کہ اس نظام کو کون سے معاملے سے سروکار ہے ۔ چوٹی پر ہمیشہ ایک ہی قسم کی قابلیت کی ضرورت ہوگی ؛ مثلاً فرض کیجیے کہ جو شخص لنکاشائر کی روئی کی تجارت کو کامیابی سے منظم کر سکتا ہے وہ اس صورت میں بھی کامیاب ہوگا کہ لنڈن کے ہوائی بچاؤ کا کام اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے یا وسطی ایشیا کے دریافت حالات کا کام یا برطانوی کولمبیا سے انگلستان تک عمارتی لکڑی کی نقل و حرکت کا کام ۔ ان مختلف ذمہ داریوں کے لیے نہ تو اسے روئی کی واقفیت درکار ہوگی ، نہ ہوائی جنگوں کی ، نہ ترکستان کے مدفون شہروں کی ، نہ علم جنگلات کی اور نہ جہاز رانی کی ۔ اس کے مددگار ماتحتوں کو اپنی اپنی جگہ مختلف فنون میں مہارت درکار ہوگی ، لیکن خود اس کی اپنی مہارت ایک طرح سے خلاصے کا درجہ رکھتی ہے جس کا مدار کسی خصوصی علم پر نہیں ۔ اس طرح ہو یہ رہا ہے کہ جس قدر نظام کی وسعت بڑھتی جاتی ہے اقتدار کے اہم مناصب روز بروز ان لوگوں کے ہاتھوں میں آ رہے ہیں جو اس کام کے مقاصد سے کوئی شناسائی نہیں رکھتے جس کی وہ تنظیم کر رہے ہوتے ہیں ؛ گو یہ ناگزیر ہے لیکن اس میں خطرے موجود ہیں اور ہم اصل مبحث کی طرف متوجہ ہو کر یہ کہیں گے کہ تعلیمی میدان میں بھی اس کے خطرات ہیں ۔

تعلیمی میدان میں منتظم کے خطرات اس کی خواہش، درجہ بندی اور اعداد و شمار سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ اس میں یہ خواہش نہ پائی جائے کیوں کہ اسے بہت زیادہ وسیع مواد سے جلد جلد نپٹنا ہوتا ہے جو صرف درجہ بندی ہی سے ممکن ہے۔ بعض قسم کے مواد میں درجہ بندی مناسب طور پر تسلی بخش ہوتی ہے؛ یہ وہاں ہوتا ہے جہاں بالکل واضح قدرتی اقسام موجود ہوں۔ سبزی فروش، مٹر، پھلیاں، پالک اور کرم کلہ بیچتا ہے اور کبھی اسے رکنے اور اپنے آپ سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ ''آیا یہ چیز مٹر ہے یا گوبھی''۔ بچوں کا معاملہ مختلف ہے۔ یہ سوال کہ ایک خاص لڑکا دماغی طور پر ناقص ہے یا نہیں، عام طور پر بحث طلب سوال ہوتا ہے، جس کا سائنسی لحاظ سے کوئی ٹھیک جواب نہیں دیا جا سکتا، لیکن انتظامی لحاظ سے ٹھیک جواب ضرور دینا پڑے گا۔ لڑکے کو یا مخصوص مدرسے میں بھیجنا ہوگا یا معمولی مدرسے میں رہنے دیا جائے گا، اس لیے منتظم ایک ایسی صحت و درستی تک پہنچنے کے لیے ذرائع کی جستجو کرتا ہے جو فطرت نے پیدا نہیں کی۔ یہ ہے ان وجوہ میں سے ایک جن کی بنا پر وہ ذہنی امتحانات کا دل دادہ ہوتا ہے۔ جس چیز کا اطلاق ناقص العقل لڑکے کے معاملے میں ہوتا ہے اس کا اطلاق اور ذہنی درجہ بندیوں پر بھی ہوتا ہے۔ جو آدمی بچوں کی ایک چھوٹی جماعت سے مشفقانہ سلوک کرتا ہے وہ ان سے بطور افراد واقف

ہوتا ہے اور ان کے متعلق کچھ ایسے احساسات رکھتا ہے جنھیں الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے۔ ایسا آدمی اکثر بچے کی کسی نرالی چیز ہی کو سب سے زیادہ پسند کرے گا، لیکن جو آدمی بچوں کو دور سے محکمانہ رپورٹوں کی دھند میں سے دیکھتا ہے وہ اس قسم کی چیزوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ چاہتا ہے کہ سب بچے ایک ہی جیسے ہوں کیونکہ اس سے اس کا کام آسان ہو جائے گا، لیکن وہ عمر، صنف، قومیت اور مذہب کی بنا پر درجہ بندی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بہت زیادہ روشن خیال آدمی بھی ذہنی امتحانات کی بنا پر درجہ بندی کو جائز سمجھتا ہے، لیکن بہت زیادہ روشن خیال بھی یہی پسند کرتا ہے کہ ہر چیز بندھی ملی ہو۔ وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ ہر زندگی میں کچھ یگانہ اوصاف ہوتے ہیں جو ہر انسان کو باقی تمام انسانوں سے مختلف بناتے ہیں، اس لیے یہ اندیشہ ہے کہ مبادا افسران تعلیم اس یکسانی کی ہمت افزائی کریں جس طرف بہر حال دنیا جھکتی جا رہی ہے۔

یہ ایک انتظامی سوال ہے اور اس کا حل بھی انتظامی ہی ہے، یعنی عدم مرکزیت۔ اگر کبھی عالم گیر حکومت قائم ہوئی تو وہ یقیناً تمام تعلیم پر ایک گونہ نگرانی رکھے گی، وہ مقامی وطنیت کی حد سے زیادہ تعلیم کو ممنوع قرار دے گی اور ممکن ہے وہ ایسے نظریات کو بھی ممنوع قرار دے دے جو اس کے نزدیک رجعت پسندانہ ہوں، لیکن باقی ہر لحاظ سے بلا شبہ

وہ تعلیم کو مقامی تنظیم کے ہاتھوں میں چھوڑ دے گی۔ اگر وہ سائنسی روح سے سرشار ہوئی تو وہ نئے طریقوں سے مختلف تجربوں کی اجازت بھی دے دے گی۔ سر دست اکثر منتظمین تجرباتی جذبے سے نا آشنا ہیں لیکن اگر تعلیم زیادہ سائنسی ہوگی تو یہ چیز زیادہ عام ہو جائے گی۔ سائنسی ریاست میں نقائص اور مستثنیات کے برداشت کرنے کے لیے ہمیں تجرباتی روح کی نشو و نما ہی کا انتظار کرنا چاہیے۔ نقائص اور مستثنیات کے بغیر ترقی کم اور تنوع ناکافی ہوگا، لیکن میرا خیال ہے کہ شاید جب افسروں کو صحت مند سائنسی تعلیم ملنے لگے تو وہ بھی اس چیز کے قائل ہو جائیں، لیکن یہ تعلیم صرف طبیعیات اور علم کیمیا کی نہ ہو بلکہ حیاتیات کی بھی ہونی چاہیے۔

اگرچہ یہ بات اہم ہے کہ ہم انفرادیت کے جائز مطالبات کو نہ بھولیں تاہم گنجان آبادی کی ایک صنعتی دنیا میں یہ ضروری ہے کہ اس پر پہلے وقتوں کی نسبت زیادہ پابندی لگائی جائے اور یہ پابندی انفرادی نفسیات کے متعلق بھی ہو۔ ہم میں سے جو لوگ بڑے شہروں میں رہتے ہیں انہوں نے ہجوم میں رہنے کے ایسے طور طریقے سیکھ لیے ہیں جو گڑ بڑ کو روکتے ہیں۔ ہم دائیں ہاتھ چلتے ہیں، مناسب رفتار کا خیال رکھتے ہیں اور سڑکوں پر وہیں مڑتے ہیں جہاں مڑنا چاہیے۔ یہ معمولی اور بیرونی معاملات ہیں لیکن زیادہ سنجیدہ معاملات میں بھی کچھ ایسی ہی چیزوں کی ضرورت

ہے ۔ بپتسمہ (John the Baptist) دینے والا یوحنا ناکافی کپڑے پہنے گھومتا پھرتا اور چلا چلا کر کہتا ''ارے لوگو! اپنے گناہوں سے توبہ کر لو کیونکہ آسمانی بادشاہت قریب ہے'' اگر کوئی آدمی لندن یا نیویارک میں ایسا کرے اور اس کے گرد ایسا ہجوم جمع ہو جائے کہ آمد و رفت ہی بند ہو جائے تو پولیس کو اس سے کہنا پڑے گا کہ اگر پھر ایسے خیالات کا اظہار کرنا چاہتے ہو تو پہلے کوئی ہال کرائے پر لے لو ۔ ایک صنعتی معاشرے میں بہت کم لوگ اپنے کام میں مستقل اکائی کا درجہ رکھتے ہیں ۔ ایک بڑی اکثریت منتظم جماعتوں سے وابستہ ہے اور انہیں اجتماعی مہموں میں اپنے حصوں کا کام کرنا پڑتا ہے اس لیے شہریت اور سماجی تعاون کا احساس پہلے کے مقابلے میں زیادہ ضروری ہے ، لیکن یہ بات اہم ہے کہ انفرادی قوت فیصلہ اور انفرادی ہدایت کاری میں بہت زیادہ کمی کیے بغیر یہ چیز حاصل کی جائے ۔

اگر ایک آدمی کی زندگی کو اس کے اپنے زاویۂ نگاہ یا عام دنیا کے زاویۂ نگاہ سے تسلی بخش بنانا مقصود ہے، تو اس کے لیے دو قسم کی ہم آہنگیوں کی ضرورت ہے : عقل ، جذبات اور ارادوں کی اندرونی ہم آہنگی اور دوسروں کے کے ارادوں کے ساتھ بیرونی ہم آہنگی ۔ دونوں لحاظ سے موجودہ تعلیم ناقص ہے ۔ اندرونی ہم آہنگی تو اس مذہبی اور اخلاق تعلیم سے رک جاتی ہے جو بچپن اور جوانی میں دی جاتی ہے ۔ یہ تعلیم بعد کی زندگی میں عموماً جذبات پر تو اپنا قابو

باق رکھتی ہے لیکن عقل پر نہیں ، چنانچہ ارادہ ڈگمگاتا رہتا ہے اور جذبات اور عقل میں سے جس کو وقتی طور پر غلبہ حاصل ہوتا ہے، اسی کے مطابق وہ کبھی ایک طرف جھک جاتا ہے اور کبھی دوسری طرف ۔ اگر بچوں کو ایسے نظریات سکھائے جائیں جنھیں عقل بالغ قبول کر لے تو ایسی کشمکشوں کی روک تھام ممکن ہے ۔ غیر سرکاری مدارس میں چھوٹے پیمانے پر ایسا ہو سکتا ہے لیکن ریاست کے تعاون کے بغیر یہ چیز اس قدر کافی وسیع پیمانے پر ممکن نہیں جس سے تجرباتی اہمیت کے نتائج سے زیادہ کچھ اور چیز حاصل ہو ۔

دوسروں کے ارادے سے بیرونی ہم آہنگی کا معاملہ زیادہ مشکل ہے اور اس کا پورا حل ممکن نہیں ۔ مقابلہ اور تعاون دونوں قدرتی انسانی سرگرمیاں ہیں اور انفرادیت کی تباہی کے بغیر مسابقت کو مکمل طور پر دبایا نہیں جا سکتا، لیکن جو مقابلہ جدید دنیا میں نقصان دہ ہے وہ انفرادی اور غیر منظم مقابلہ نہیں ۔ دو مرد ایک ہی عورت کے لیے ایک دوسرے کو نقصان پہنچائے بغیر مقابلہ کر سکتے ہیں بشرطیکہ ان کی رقابت کی نوبت قتل تک نہ پہنچے ۔ دنیائے جدید میں افتراق کی خطرناک صورت وہ ہے جو قوموں اور طبقوں کی منظم شکل اختیار کرتی ہے ؛ جب تک ناہم آہنگی کی یہ صورت باقی رہے گی ، سائنس اور فنی کمال نے جن فوائد کو ممکن بنا دیا ہے، دنیا ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی ۔ زمانۂ حال کی تعلیم کی وجہ سے اقوام میں ناہم آہنگی کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے اور مدارس میں

بین‌الاقوامی پروپیگنڈے کے جاری کرنے سے اسے ختم کیا جا سکتا ہے ، لیکن جب تک پہلے سیاسی بین‌الاقوامیت فتح نہ پا لے اس وقت تک اس کا امکان مشکل ہے ۔ تعلیم سیاسی کامیابی کو پائیدار تو بنا سکتی ہے لیکن غالباً اس وقت تک اس کا سبب نہیں بن سکتی جب تک وہ قومی ریاستوں کے ہاتھ میں ہے ۔

وہ زمانے بھی تھے جب لڑائی کی صورت میں مقابلہ فاتحین کے لیے مفید ہوتا تھا ۔ وہ زمانہ گزر گیا ہے ، اب یہ بات ہر صاحب فکر پر واضح ہے کہ اگر تمام مسلح افواج خواہ وہ کسی جگہ بھی ہوں ، سبک دوش کر دی جائیں ، اقوام کے تمام جھگڑے بین‌الاقوامی عدالتوں میں طے کیے جائیں ، تمام درآمدی محصول موقوف کر دیے جائیں اور تمام لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں آزادی سے آ جا سکیں تو ہر قوم کی مسرت میں اضافہ ہوگا ۔ سائنس نے ہماری تکنیک کو یوں بدل دیا ہے کہ دنیا ایک معاشی اکائی بن گئی ہے ، لیکن ہمارے سیاسی ادارے اور نظریے ہماری تکنیک سے پیچھے رہ گئے ہیں اور ہر قوم نے معاشی علیحدگی سے اپنے آپ کو مصنوعی طور پر مفلس بنا رکھا ہے ۔ ہم محنت بچانے والے آلے ایجاد کرتے ہیں اور بے روزگاری ہمیں ستاتی ہے ۔ جب ہم اپنی مصنوعات کو بیچ نہیں سکتے تو بظاہر اس خیال سے مزدوری کم کر دیتے ہیں کہ لوگ جتنا کم کمائیں گے اتنا ہی زیادہ خرچ کریں گے ۔ یہ تمام خرابیاں ایک سرچشمے سے پیدا ہوتی ہیں ، یعنی جہاں ہماری تکنیک کا تقاضا یہ ہے کہ تمام نوع انسان ، پیدائش

اور کھپت کی ایک اکائی کے طور پر تعاون کرے ، ہمارے جذبات اوز سیاسی نظریے مسابقت پر اصرار کرتے ہیں ۔

ہماری دنیا دیوانی ہے ، ۱۹۱۴ء سے یہ تعمیری نہیں رہی کیوں کہ لوگ بین الاقوامی تعاون پیدا کرنے کے لیے عقل کی پیروی نہیں کرتے ، بلکہ وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ نوع انسان مخالف گروہوں میں بٹی رہے ۔ اپنی بقا کے لیے انسانی عقل سے کام نہ لینے کی اجتماعی ذمہ داری زیادہ تر غیرمعقول اور تخریبی جذبات پر ہے ۔ یہ جذبات ان لوگوں کے لاشعور میں چھپے رہتے ہیں جن کے ساتھ بچپن ، لڑکپن اور آغاز بلوغت میں غیر معقول برتاؤ کیا گیا ہو ۔ باوجودیکہ پیداوار کی تکنیک برابر بہتر ہوتی جا رہی ہے ، ہم سب مفلس سے مفلس تر ہو رہے ہیں ۔ ہم اگلی لڑائی کی دہشت ناکیوں سے پوری طرح آگاہ ہیں لیکن پھر بھی ہم نوجوانوں میں باقاعدہ وہی جذبات پیدا کر رہے ہیں جو ایسی جنگ کو ناگزیر بنا دیں ۔ سائنس کے ہوتے ہوئے ہم عملی مسائل پر معقولیت سے غور کرنے کے بارے میں مخالف رد عمل کا اظہار کرتے ہیں ۔ قدرت پر تسلط بڑھتا جا رہا ہے لیکن پھر بھی بہت سے لوگ از منۂ متوسط کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ مایوس اور بے بس محسوس کرتے ہیں ۔ ان تمام امور کا سرچشمہ بیرونی دنیا میں نہیں ، نہ ہماری فطرت کے خالص عرفانی حصے میں ہے ، کیوں کہ ہمارا علم پہلے انسانوں کے مقابلے میں زیادہ ہے ، بلکہ یہ سرچشمہ جوشیلی عادات میں جاگزین ہے اور ان جذبات میں واقع ہے جو ہم میں جوانی

میں پھونکے گئے تھے، اور اس خوف میں جو بچپن میں پیدا کیا گیا تھا ۔ ہمارے مسائل کا علاج یہ ہے کہ لوگوں کو معقول بنایا جائے اور انھیں معقول بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تعلیم معقول طور پر ہو ۔ اس وقت تک ہم جن عوامل پر غور کرتے رہے ہیں ان سب کا رجحان تباہی کی طرف ہے ۔ مذہب حماقت اور حقیقت کے ناکافی احساس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے ، جنسی تعلیم اکثر اعصابی عارضے پیدا کرتی ہے اور جہاں یہ ظاہراً ایسا نہ کرے وہاں بھی اکثر لاشعور میں پریشانی کا بیج بو دیتی ہے ، جس سے بالغ زندگی کی خوشی ناممکن ہو جاتی ہے ۔ مدارس میں جس قومیت کی تعلیم دی جاتی ہے اس کا [illegible] نوجوان کا نہایت اہم فرض انسانوں [illegible] ہے ۔ طبقاتی احساس سے اقتصادی بے انصافی پر رضامندی روز بروز بڑھتی ہے اور مقابلے سے سماجی کشمکش میں سنگ دلی کا اضافہ ہوتا ہے ۔ کیا یہ بات قابلِ تعجب ہے کہ وہ دنیا جس میں ریاست کی سب طاقتیں نوجوانوں میں دیوانگی ، حماقت ، قتل انسان کے لیے مستعدی ، اقتصادی بے انصافی اور سنگ دلی پیدا کرنے میں مصروف ہوں ، وہ دنیا خوش نہیں ہے ؟ کیا ایسے آدمی کو بدکردار اور مخرب اخلاق ہونے کا مجرم قرار دیا جا سکتا ہے جو عہدِ حاضر کی اخلاق تعلیم میں ان برائیوں کی جگہ عقل ، شفقت اور اور احساسِ انصاف کو جگہ دینا چاہتا ہے ؟

مجلس ترقی ادب لاہور کی چند اہم مطبوعات

۱ - تاریخ ادب اردو : جلداول ، از ڈاکٹر جمیل جالبی 100/
۲ - تاریخ ادب اردو : جلد دوم ، از ڈاکٹر جمیل جالبی 180/-
۳ - تعلیقات خطبات گارسیں دتاسی :
از ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین 70/-
۴ - سندھ میں اردو شاعری : از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ 30/-
۵ - زبان اور شاعری : از محمد ہادی حسین 15/-
۶ - البدیع : از سید عابد علی عابد 30/-
۷ - مقالات تاثیر : مرتبہ ممتاز اختر مرزا 60/-
۸ - مولانا ظفر علی خان — احوال و آثار :
از ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی 50/-
۹ - تاریخ لاہور : از کنہیا لال 70/-
۱۰ - حلقہ ارباب ذوق : از یونس جاوید 45/-
۱۱ - دیوان غالب — منظوم پنجابی ترجمہ : از امیر عابد 90/-
۱۲ - کلیات ناسخ : جلد اول ، مرتبہ یونس جاوید 93/-
۱۳ - نفسیاتی تنقید : از ڈاکٹر سلیم اختر 60/-
۱۴ - آغا حشر کے ڈرامے : جلد اول ، مرتبہ عشرت رحمانی 70/-
۱۵ - جدید فارسی شاعری : ترجمہ از ن - م - راشد 50/-
۱۶ - شذرات فکر اقبال : طبع دوم
ترجمہ از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی 18/-
۱۷ - خطبات اقبال : (پنجابی ترجمہ) از پروفیسر شریف کنجاہی 30/-
۱۸ - جاوید نامہ : (منظوم پنجابی ترجمہ)
از پروفیسر شریف کنجاہی 19/-
۱۹ - ذکر رسولؐ — مثنوی رومی میں :
از ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی 25/-

مجلس ترقی ادب - کلب روڈ - لاہور